رجسٹرڈ نمبر ۱۱۰۴۷　　جلد ۱۴ - شمارہ ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول معہ

## فہرست مضامین ستمبر ۱۹۲۸ء


ملاحظات ۲
قایم چاندپوری　ابو المنعم سعیدی بی اے　۹
فلسفۂ مذہب　سید مقبول احمد بی اے　۲۹
من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال (افسانہ)　مجنوں گورکھپوری　۴۱
شاہان بہمنیہ　تمکین کاظمی　۵۹
باب المراسلۃ والمناظرۃ　۶۲
باب الاستفسار　۷۶

حصۂ نظم :-　اختر شیرانی　۸۵
〃　دلی　۸۷
〃　نحو
〃　امین حزیں　۸۹
غزلیات :-　فراق گورکھپوری　۹۱
〃　فرخ بنارسی
معلومات و اقتباسات　۹۲-۹۶


خط و کتابت میں نمبر خریداری کا لکھنا انتہائی ضروری ہے جتنا خط پر ٹکٹ لگانا، اسے یاد رکھئے۔ "مینیجر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نگار

اوڈیٹر:- نیاز فتحپوری

| جلد ۱۴ | ستمبر سنہ ۱۹۲۸ء | شمارہ ۳ |
| --- | --- | --- |

## ملاحظات

گزشتہ ماہ کے تمام ان واقعات میں جن کو سیاسیات ہند سے خاص تعلق ہے دو واقعے اس قدر اہم ہیں کہ اگر کبھی "تاریخ آزادی ہند" مرتب کی گئی تو شاید اُنھیں دونوں کو "استعماری سیاسیات" کا سنگ بنیاد قرار دیا جائے گا۔

صوبۂ بمبئی کی حکومت ایک آبادی میں جس کا نام بردولی ہے، لگان میں اضافہ کا اعلان کرتی ہے، غریب کسان جن کی تمام اُمیدوں کا مرکز ان کی کاشت ہوا کرتی ہے، اس ناجائز حکم کے خلاف بصد الحاح وزاری احتجاج کرتی ہے، لیکن حکومت و سلطنت جس کے ہاتھ ہمیشہ ہر ملک و زمانہ میں خون سے رنگین نظر آتے ہیں۔ فریاد وزاری کی کوئی پروا نہیں کرتی اور خانماں بربادی اور قید و بند کی سزائیں، جو بڑا ذریعہ مستبد حکمرانی کی کامیابی کا ہے، ان غریب کاشتکاروں پر مسلط کر دی جاتی ہے، اور یہ خاموشی کے ساتھ اس کو برداشت تو کر لیتے ہیں۔ لیکن حکومت کے فیصلہ کو جائز مان کر خود اپنے ہاتھوں سے وہ چیز پیش نہیں کرنا چاہتے جو اُن سے بارہا اور ہمیشہ بجبر چھینی گئی۔ خدا کا ایک بندہ (مسٹر پٹیل) اس مظلوم جماعت کا قائد بنکر اس مقدس جذبہ کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بغیر کسی ہنگامہ و فساد، شور و شر اور فریاد و زاری کے مصائب جھیلنے پر سب کو آمادہ کر دیتا ہے۔ پھر دنیا میں تھپڑ کا جواب گھونسے سے، خنجر کا جواب شمشیر سے تو دیا جا سکتا ہے، لیکن اگر کوئی ہماری ضرب کے

سامنے اپنا سر جھکا دے، تیغ و تفنگ کو دیکھکر اپنا سینہ عریاں کردے، جو خود اپنے ہاتھ سے دشمن کے تیر دستان اپنے دل میں پیوست کرلے، تو پھر اس کا جواب ہتیار ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وہ اصل تعلیم تھی جسے مہاتما گاندھی نے اول اول پیش کیا تھا اور جو اب اسی مقام پر کامیاب ہوئی جہاں اب سے پہلے وہ ناکامیاب رہی تھی۔

بمبئی کی حکومت نے، ولایت کے ان خداوندان پارلیمنٹ نے جن کے ہاتھ میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہے صاف صاف کہدیا کہ کسانوں کا یہ خاموش مقابلہ ایک ایسی غیر آئینی جنگ ہے جس کو حکومت ہند بھی برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے اس کے شاہانہ اقتدار کو صدمہ پہونچتا ہے۔ لیکن اگر ادھر یہ عزم ملوکانہ تھا، تو اس طرف بھی یہ عاجزانہ اصرار تھا کہ:-

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ایک ہفتہ تک ہندوستان متحیرانہ نتیجہ کا انتظار کرتا رہا کہ دیکھئے حکومت کی قہرمانیت کونسا طریقۂ سزا اختیار کرتی ہے لیکن اس کے بعد ہی دفعتہً یہ خبریں آنے لگیں کہ صوبۂ بمبئی کی حکومت اور حکومت ہند باہم مشورت پر آمادہ ہیں اور آخر کار جب اس منظر کے سامنے سے پردہ اٹھا تو حقیقت یہ نظر آئی کہ جسے دنیا غالب سمجھتی تھی وہ مغلوب ہے اور مغلوب غالب۔ قیدی آزاد ہو گئے، زمینیں واپس دیدی گئیں، اور اضافہ لگان کے متعلق تحقیقات شروع کر دی گئی کہ آیا وہ کسی حد تک جائز بھی ہے یا نہیں۔

اگر حق و صداقت کبھی مغلوب ہو جائیں تو کذب و باطل کے مقابلہ میں انکا سب سے بڑا حربہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک عزم استوار کے ساتھ اپنے مرکز پر اپنے اصول کی حمایت پر قایم رہیں، یہاں تک کہ کذب خود اپنی پردہ دری کرے اور باطل خود شرما کر منھ پھیر لے۔

پھر بردولی کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے جسکو نظر انداز کیا جا سکے بلکہ اس کے ساتھ ایسے اہم و عظیم الشان نتایج وابستہ ہیں کہ اگر ہماری موجودہ نسل نے اس کی پرواہ نہ کی تو آنے والی نسلیں جب اپنی آزادی کی داستان سنایا کرینگی تو اس کی ابتدا اسی بردولی کے واقعہ سے ہوا کریگی۔

دوسرا واقعہ جو اس سے کم اہم نہیں، وہ ہے جو ۲۸ اگست کو لکھنؤ میں رونما ہوا اور جسے آل پارٹیز کانفرنس کا اجتماع کہتے ہیں۔

نہرو کمیٹی نے جو رپورٹ "مستقبل ہند" کے متعلق مرتب کی ہے، خواہ اس میں کتنے ہی نقائص کیوں نہ ہوں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام اقوام ہند کو کسی ایک مرکز پر لانے کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ہندوستان کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ یہاں اب تک سیاسیات و مذہب میں تفریق نہیں ہو سکی اور وہ ملکی آزادی کو مذہبی آزادی سمجھ رہے ہیں، اس زمانہ میں جو تفریق ہندو مسلمانوں کے درمیان بعض نہایت ہی معمولی مسائل مذہبی پر پیدا ہو گئی ہے، وہ ایسا بدنما داغ ناصیۂ انسانیت کے لئے ہے کہ اس کو لیکر منہ دکھانے کی جراٴت ہم میں نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کا بہترین علاج تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہر قوم اپنی اپنی جگہ مذہبی رواداری کو زیادہ فراخ حوصلگی اور وسعت نظر سے دیکھے، لیکن چونکہ یہ فی الحال ممکن نہ تھا اس لئے دوسری تدبیر یہی ہو سکتی تھی کہ کم از کم سیاسیات میں ان کے لئے کوئی غرض

مشترک پیدا کر دیجائے

ولایت کے ارباب حل وعقد کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ ہندوستان کا مطالبہ ہی آج تک متعین نہیں ہو سکا ہے کہ اسپر غور کیا جائے سو یہ اعتراض اس اجتماع نے دور کر دیا اور ہندوستان کی تمام جماعتوں نے متفق و ہم آہنگ ہو کر وہ اسکیم پیش کر دی جو آزادی ہند کی منزل سے قریب تر پہونچا دینے والی ہے۔ یقیناً ڈومینین ہوم رول اہل ہند کی خواہشات کا منتہائے نظر نہیں ہے، لیکن نہرو کمیٹی کے مطالبات بھی ہمارے لئے آخری نقطہ کا درجہ نہیں رکھتے۔ آج ہم ایک چیز کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کے معنے یہ نہیں کہ کل ہم کوئی اور مطالبہ نہیں کر سکتے۔ پھر اگر فی الحال ہندوستان کو وہی مرتبہ ملجائے، جو اسٹریلیا، آئرلینڈ وغیرہ کو حاصل ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ آزادی کا دوسرا قدم اُٹھانے کے لئے ہم کو اجازت لینے کی ضرورت نہ پڑے گی اور اگر راہ میں موانع حائل ہوئے تو اُن کے دور کرنے کے لئے ہم اپنے ہاتھوں سے بھی کام لے سکیں گے۔ نہرو کمیٹی کا سب سے زیادہ کمزور و نامناسب پہلو یہ ہے کہ تمام صوبوں کو مرکزی حکومت کا ماتحت قرار دیا گیا ہے۔ اور اس طرح گویا وہ چنگاری رہنے دی گئی ہے جو کسی وقت ہندو مسلمانوں میں پھر آتش جنگ مشتعل کر سکتی ہے، لیکن اُمید ہے کہ جب یہ اسکیم عملی صورت اختیار کریگی اس وقت یہ نقص بھی دور ہو جائیگا یہ بھی عجیب بات ہے کہ جس تاریخ کو ہندوستان میں اتحاد و یکرنگی کا یہ منظر پیش تھا، اسی تاریخ میں دول مغرب، میثاق۔ کیلاگ پر دستخط کر رہی تھی تاکہ عفریت جنگ سے ہمیشہ کے لئے دنیا کو آزاد کر دیں، کیا یہ عہد و میثاق حقیقتاً دنیا دی ہوس سے جدا ہو کر خلوص و صداقت کے ساتھ کیا گیا ہے، کیا برطانیہ کا اس میثاق پر دستخط کرنا واقعی سچائی پر مبنی ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ہم کو زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں کیونکہ اہل ہند جو مشترک مطالبہ پیش کر رہے ہیں وہ اس کا بہترین معیار ہے۔ اور اگر حکومت برطانیہ نے واقعی میثاق کیلاگ پر خلوص کے ساتھ دستخط ثبت کئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمارے مطالبات کو رد کر دے۔ اور مزے مکڈانلڈ کی اس پیشین گوئی کو غلط ثابت کر دے کہ "ہماری کامن ولتھ میں بہت جلد ایک او ملک کا اضافہ ہونے والا ہے جس کا نام ہندوستان ہے"

---

شاہ افغانستان کا معہ اپنی ملکہ کے آزادانہ سیاحت یورپ کرنا، تاریخ افغانستان کا بالکل پہلا واقعہ ہے، لیکن جس طرح کسی ایک غیر متوقع واقعہ کے ظہور پر پے در پے بہت سے عجیب و غریب واقعات کا ظہور ہونے لگتا ہے، اسی طرح امیر امان اللہ خان شاہ افغانستان اور ان کی ملکہ ثریا بیگم کے واقعہ سیاحت یورپ نے بہت سے ایسے واقعات پیش کر دیئے ہیں جن پر مغرب و مشرق دونوں کو حیرت ہونی چاہئے۔

افغانستان ایسے جاہل و غیر ترقی یافتہ ملک کا فرمانروا تمام ممالک یورپ کا سفر کرے اور کسی ایک جگہ بھی وہ کوئی ایسی غلطی نہ کرے جس سے اُس کے شاہانہ مرتبہ اور سیاسی اغراض کو صدمہ پہونچے، یقیناً بہت حیرت انگیز واقعہ ہے، برطانیہ قوت و ثروت، صنعت و تجارت، علم و دولت اور ہر اس چیز کی نمائش کرتا ہے جو ایک انسان کو مرعوب کر سکتی ہے لیکن کوہستانی

علاقہ کا وحشی فرمانروا سب کچھ دیکھتا ہے اور غیر متاثرانہ طور سے واپس آتا ہے، فرانس، جرمنی، روس، غرض ہر ملک اپنی انتہائی قوت صرف کردیتا ہی کہ اس نوجوان فرمانروا کو اپنی طرف مائل کرلیا جائے لیکن آج تک کسی کو یہ علم حاصل نہ ہوسکا کہ وہ کس غرض سے گیا تھا اور کس حدتک کامیاب واپس آیا۔ یقیناً یہ ڈپلومیسی ایک افغانی دماغ سے بہت بعید معلوم ہوتی ہی، لیکن واقعہ کو کیونکر مٹایا جاسکتا ہی، حقیقت کو کیسے محو کیا جاسکتا ہے۔ ایسا ہوا اور سب نے دیکھا۔

پھر افغانستان واپس آتے ہی بڑا جرگہ کی ترتیب دینا یعنی پارلیمنٹری اسلوب حکومت کی بنیاد ڈالنا، تعلیم نسواں کی طرف خاص توجہ کرنا، تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دینا، عورتوں سے پردہ ترک کرادینا۔ ریل جاری کرنے کی تدابیر اختیار کرنا علوم وفنون کی تعلیم کے لئے فرزندان افغانستان کو باہر بھیجنا، تعلیم عامہ کی طرف سرگرمی سے قدم اٹھانا، ترتیب عسکری میں نئی روح پھونکنا، کیا ان سے ہم اس آزاد خیال اور جوان بخت فرمانروا کے آئندہ عزائم کا پتہ نہیں چلاسکتے۔ اگر اسی کیساتھ اس خبر کو بھی صحیح مان لیا جائے کہ مصطفےٰ کمال صدر جمہوریۂ ترکی سے افغانستان ازدواجی رشتہ قایم کررہا ہی اور ادھر ایران سے عصبیت مذہبی دور ہوکر زیادہ وسعت نظر سے کام لیا جارہا ہی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ہم مشرق کے لئے فال نیک نہ خیال کریں اور ہندوستان بھی اس ماحول میں آزادی کے صحیح جذبات اپنے اندر نہ پیدا کرے۔

---

کہا جاتا ہی کہ ہندوستان کی مالی حالت بہ نسبت پہلے کے بہت بہتر ہوگئی ہی یعنی اگر سنہ ۱۸۷۱ء میں فی کس بیس روپیہ سالانہ کا اوسط تھا تو اب وہ ۴۷ تک پہونچگیا ہی، جیسا کہ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا:-

| | |
|---|---|
| سنہ ۱۸۷۱ - ۲۰ | سنہ ۱۸۸۱ - ۲۷ |
| سنہ ۱۹۰۱ - ۳۰ | سنہ ۱۹۱۱ - ۵۰ |
| سنہ ۱۹۲۱ - ۴۷ | |

لیکن اگر اسی کے ساتھ گرانی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت بھی اسی کے ساتھ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہی کہ اگر آمدنی ۲۰ سے ۴۷ تک پہونچگئی ہی تو خرچ اس سے کہیں زائد ہوگیا ہے یعنی اگر پہلے اشیاء کی ارزانی کی وجہ سے ۹۳ خرچ ہوتا تھا تو اب بجائے اس کے ۳۷۰ ہوگیا۔ ذیل کے نقشہ سے مصارف کا تدریجی اضافہ معلوم ہوسکیگا:-

| | |
|---|---|
| سنہ ۱۸۷۱ - ۹۳ | سنہ ۱۸۸۱ - ۱۰۰ |
| سنہ ۱۹۰۱ - ۱۲۰ | سنہ ۱۹۱۱ - ۱۴۰ |
| سنہ ۱۹۲۱ - ۳۷۸ | |

کیا ایسی صورت میں بھی یہ حکم لگایا جائے گا کہ ہندوستان دولتمند ہوگیا ہی۔

---

مصر و برطانیہ کے تعلقات میں جو پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے اس کا سلجھنا آسان نہیں ہے۔ جنگ سے پہلے مصر سلطنت ترکی سے متعلق تھا لیکن برائے نام۔ دوران جنگ میں برطانیہ نے اپنی حمایت میں لے لیا اور صلح کے بعد وہاں اعلان ملوکیت ہوگیا اور ایوان پارلیمنٹ قایم کیا گیا۔ ہنوز وہ کوئی قابل اطمینان صورت اختیار نہ کر سکا تھا کہ سوڈان کے قصہ نے اس کو ضرب لگائی اور اب برطانیہ کی تفریک نے اس کو پھر اب سے پچیس سال قبل اٹھا کر پھینک دینا چاہا ہے۔

ہندوستان کے قبضہ کے لئے جو وسیع جال برطانیہ نے پھیلایا ہے اسی کا ایک زبردست پھندا نہر سویز کا اقتدار ہے جس کی بقا کی صورت صرف یہ ہے کہ مصر پر اثر قایم رکھا جائے۔ ادھر اہل مصر سمجھتے ہیں کہ مصر عبارت ہے صرف دریائے نیل سے کیونکہ ان کے ملک کی کاشت کا واحد ذریعہ وہی ہے۔ اس لئے اگر اسوقت تک کوئی وزارت وہاں کامیاب نہیں ہوئی تو جائے حیرت نہیں کیونکہ وہاں آزادی مفقود ہے اور ہنوز مصر اہل مصر کا نہیں ہو سکا۔

حال ہی میں امریکہ نے مصر کو ایک خود مختار سلطنت سمجھکر اس سے معاہدہ کرنا چاہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ سے مصر کا کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل لحاظ سمجھا جا سکتا ہے جب تک خود مصر یہ نہ محسوس کرے کہ اس کے ہاتھ پاؤں واقعی آزاد ہیں اور وہ اپنے ملک کی ترقی کے لئے، اپنی قوم کی بقا و تحفظ کے لئے بالکل ذمہ دارانہ طور پر کوئی طرز عمل اختیار کر سکتا ہے۔

بہرحال مصر اگر کسی قربانی کے لئے طیار نہیں تو اس کو انتظار کرنا چاہئے، حتیٰ کہ خود برطانیہ کے اندر کا انقلاب کوئی صورت بہتری کی مصر کے لئے پیدا کرے۔

---

جو صورت مصر میں ہے تقریباً وہی عراق میں پیدا ہے، شاہ فیصل ایک برطانوی مشیر کے ہاتھ میں ہے اور ابن سعود کے ساتھ برطانیہ کے وہ تمام مواعید جنھوں نے اس کے اندر روح پھونک رکھی تھی بیکار ثابت ہو رہے ہیں سرزمین عراق وہ جگہ ہے جہاں چھ ہزار سال سے صرف اہل عرب ہی کا تصرف اقتدار رہا ہے اور کسی دوسری قوم کو وہاں حکومت کرنے کا فخر حاصل نہیں ہوا۔ لیکن برطانیہ اب یہاں کی خصوصیت کو محو کرنا چاہتا ہے، کیونکہ سرزمین عراق کا میدانی علاقہ ہوائی جہازوں کا اسٹیشن بننے کے لئے بہت موزوں ہے اور اس سے بہتر مقام انگلستان و ہند کے مابین ہوائی عسکریت کا مرکز بننے کے لئے کوئی دوسرا نہیں ہے۔

الغرض ہندوستان کا سوال ایسا عجیب و غریب سوال ہے کہ ایشیا اور یورپ کے ہر حصہ پر اس کا اثر پڑ رہا ہے۔ اس لئے وہ دن بھی کیسا مبارک دن ہوگا جب ہندوستان کی آزادی کے ساتھ اور بھی بہت سے حصے کرۂ زمین کے الجھنوں سے پاک ہو جائیں گے۔

---

یورپ کی سرزمین بھی کسقدر مجموعۂ اضداد ہے، ایک طرف اندرونی بے چینی اور خلش کا یہ عالم ہے کہ سرمایہ اور عمل کی جنگ نے آبادی کے ایک معقول حصہ کو مضطرب بنا رکھا ہے، یہاں تک کہ شروع اگست تک صرف ایک ملک انگلستان میں بیکار مزدوروں کی تعداد

۱۲۸۳۹۰۰ تک پہونچ چکی تھی - لیکن دوسری طرف تعیش کا یہ عالم ہو کہ گویا وہ کسی تلخ احساس کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہو۔ حال ہی میں پیرس کے گریون میوزیم میں ایک ایسا قصر طیار کیا گیا ہو جسے دار العجائب یا سحر کدہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا اس کے اندر پہونچتے ہی ایک شخص حیران رہجاتا ہو کہ وہ کہاں پہونچ گیا۔ راجہ اندر کا اکھاڑا، الف لیلہ کے عجائب، بوستان خیال کی طلسم بندیاں، سب دفعتہً اس کی نگاہوں سے گزر جاتی ہیں اور وہ مبہوت و متحیر ہوکر دیکھنے لگتا ہو کہ یہ کیا تماشہ ہو۔

کبھی اس کو یہ نظر آتا ہو کہ وہ کسی ہندو پرستشگاہ میں ہو جہاں سوائے مندروں کے کچھ نہیں ہو، کبھی وہ دیکھتا ہو کہ عہد اسلامی کے بیشمار محل اس کے سامنے ہیں کبھی وہ اپنے آپ کو لق و دق صحرا میں پاتا ہو، کبھی منظر باغ و بہار میں، کبھی وہ بارش نور کا لطف اُٹھاتا ہو اور کبھی ظلمات کا، اور یہ سب کرشمہ ہو روشنی کا جس کے ذریعہ سے ۴۵ مختلف منظر پیدا کئے جاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہو کہ ۲۵۰۰ مختلف قسم کے کہربائی روشنیاں ان مناظر کے پیدا کرنے کیلئے استعمال کی جاتی ہیں۔

---

صوبۂ بہار میں ہندو خواتین کی ایک جماعت نے پردہ کے خلاف آواز بلند کی ہو۔ اور ایک باقاعدہ انجمن قائم کی گئی ہو تاکہ پردہ کی مخالفت میں تمام ہندوستان کی عورتوں کو ہم آہنگ بنایا جائے اور اس بلا سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کی جائے۔

غالباً یہ پہلا عملی اقدام ہو جو پردہ کے باب میں ظاہر کیا گیا ہو اور اُمید ہو کہ سرزمین ہند کی خواتین بلا تفریق قوم و مذہب اس میں حصہ لیکر اس تحریک کو واقعی مفید بنانے میں پوری کوشش کریں گی۔

ہندوستان کے طبقۂ نسواں میں یہ تحریک آہستہ آہستہ اس قدر مقبول ہو چکی ہو کہ اب پردہ اُٹھا دینے کے برکات سمجھانے کے لئے دلائل و براہین پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تو صرف اس قدر کرنا ہو کہ جو لوگ اس کے مخالف ہیں وہ عمل سے اپنی مخالفت ثابت کریں اور جو عورتیں اس کو اپنے لئے مضرت رساں سمجھتی ہیں وہ سختی کے ساتھ اپنے مردوں سے مطالبہ کریں۔ اور اور اس وقت تک کہ یہ مطالبہ پورا نہ کرالیں چین سے نہ بیٹھیں، لیکن یہ صرف ان عورتوں کے لئے جائز ہوگا جو سمجھتی ہیں کہ پردہ سے کیا مضرتیں ہیں اور وہ پردہ اُٹھنے سے کیونکر دور ہو سکتی ہیں۔ لیکن جن کو اس کی خبر نہیں ہو ان کے لئے یہی مناسب ہو کہ وہ پہلے اپنی جگہ اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کر لیں اور پھر جو کچھ وہ مناسب سمجھیں کریں۔

---

آج کل ایک اہم مسئلہ کمسنی کی شادی کا ہو جس کے متعلق کوشش ہو رہی ہو کہ قانون کے ذریعہ سے اُس کو روکا جائے اس میں شک نہیں کہ کمسنی کی شادی نہیں بلکہ مواصلت خواہ وہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے لئے حد درجہ مضر صحت ہو اور اس کا سدباب ہونا چاہئے، لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ نابالغ کی شادی کے متعلق بھی ولی کے اختیارات کو ناجائز قرار دیا جائے اسلام میں جو طریق آج کل رائج ہو اس میں اگر تھوڑی سی تبدیلی کردی جائے تو پھر کسی قانون کے بنانے کی ضرورت نہیں رہتی نابالغہ کے نکاح کے متعلق یہ مسلم ہو کہ اگر بالغ ہونے پر وہ نکاح کو قائم رکھنا نہ چاہے تو نکاح فسخ ہو جائیگا۔ (بشرطیکہ

یہ شادی باپ یا دادا نے نہیں کی ہو) میری رائے میں اس شرط کو مٹا دینا چاہئے، ہر کمسنی کی شادی، بالغ ہونے کے بعد محتاج ہونی چاہئے، تصدیق ثانی کی اور اگر مرد عورت دونوں عہد طفلی کی شادی کو قایم رکھنا چاہیں تو قایم رکھی جائے ورنہ نہیں۔ قانون کے ذریعہ سے اس کے روکنے کا میں بھی مخالف ہوں، کیونکہ اس طرح خواہ مخواہ ہم اپنے معاشرتی مسائل میں غیر جماعت کو دخل دیدیں گے۔ اور یہ مسئلہ آیندہ کے لئے بہانہ ہو جائیگا۔ ہمارے اور بہت سے معاملات میں ان کو در خور حاصل کرے گا۔ اگر آج قانونی صورت سے اس کو ممنوع قرار دیدیا جائے گا تو بہت سی ان صورتوں میں جب کہ خاندانی یا دیگر مصالح کی وجہ سے کمسنی میں شادی کرنا ضروری ہوتا ہے، ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔

میری رائے میں اس مسئلہ میں کسی قانون بنانے سے پہلے، نکاح و مواصلت کے فرق کو پوری طرح محسوس کر لینا چاہئے اور اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کیا ہمارا اپنے گھر کے معاملات میں دوسرے کو پنچ بنانا ہماری قومی خودداری کی اہانت تو نہیں ہے۔

---

جولائی کے مہینے میں دو موتیں بہت سخت ہوئیں، ایک مولوی وحید الدین سلیم کی جو حیدرآباد کے جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر اردو کی حیثیت سے مامور تھے اور دوسرے مولانا شاہ عزیز اللہ صفی پوری کی۔ وحید الدین سلیم کی علمی و ادبی خدمات ایسی نہیں ہیں کہ اُن کو آسانی سے فراموش کیا جا سکے۔ موصوف کی خدمات معارف کی اڈیٹری کی سرسید مرحوم کی سکریٹری ہونے کی، مسلم گزٹ کی ادارت کی، کافی نقوش لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئی ہیں اور اس لئے ہر حلقہ میں انکی موت پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔

میرا اور سلیم صاحب کا ساتھ لاہور میں کچھ عرصہ تک رہا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسان ہونے کی حیثیت سے بھی عجیب چیز تھے مرحوم سرطان مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور یہیں لکھنؤ کی سرزمین میں انکا انتقال ہوا۔

مولانا عزیز اللہ شاہ صفی پوری عہد آخر کے بہترین فارسی جاننے والوں میں تھے اور نظم و نثر دونوں میں استادانہ قدرت انشاء رکھتے تھے مرحوم کی متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں، جن کا مختصر ذکر نگار کے صفحات میں ہو چکا ہے۔ مولانا ایک گوشہ نشین اور صاحب دل بزرگ تھے جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ وطن کے گوشۂ انزوا میں تزکیۂ نفس اور تصفیۂ اخلاق کیلئے بسر کر دیا، مولانا کا حلقۂ ارادت بھی بہت وسیع ہے لیکن عام پیروں کی طرح کبھی اُنھوں نے طلب دنیا کا جال نہیں پھیلایا اور اپنے اخلاق و عادات سے اہل صفہ کی یادگار قایم کر گئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی بعض کتابیں یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہو گئی ہیں اگر یہ صحیح ہے تو خیر، ورنہ اب ارباب علم کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے اور انکی تصانیف کے ساتھ پورا انصاف کر کے اُن سے طلبہ کو استفادہ کا موقع دینا چاہئے۔

میں عرصہ سے ارادہ کر رہا ہوں کہ ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ کروں، لیکن اس وقت تک اس کی فرصت نصیب نہیں ہوئی۔ مولانا مرحوم کے تبحر فارسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ غالب ایسے بد دماغ شخص کو بھی تعریف کرنی ہی پڑی۔

نیاز فتحپوری

# قایم چاندپوری

(بہ سلسلۂ ماسبق)

حیات انسانی تفکرات سے معمور ہے، کون ہے جو فکر سے آزاد ہے، کسی کو زر کی فکر ہے تو کسی کو جاہ و منصب کی، کسی کو کسی اور شے کی بہر حال جو ہے وہ کسی نہ کسی فکر میں مبتلا ہے، انسان لاکھ چاہتا ہے کہ مصائب و تکالیف کے شجر خار دار سے اپنے دامن کو بچائے رکھے اور دنیا میں اطمینان قلب، فراغت، آرام اور آسودگی حاصل ہو لیکن اس کی تمنا پوری نہیں ہوتی، جوں جوں وہ بچنا چاہتا ہے اسیقدر وہ علایق دینی میں پھنستا جاتا ہے، اور افکار روزگار اسے لمحہ کے لئے بھی آزاد ہونے نہیں دیتے غرض جہاں کہیں بھی رہا غم دنیا سے آسودہ نہ رہا گھر چھوڑ کر جنگل کو آباد کیا تو وہاں یہ رونا ہے ؎

کوہ اور دشت میں بھی ہم نہ رہی آسودہ ماتم قیس کیا یا غم فرہاد کیا

کمبخت دل کا معاملہ ہی نرالا ہے جہاں کسی حسین مہ جبین کا رخ زیبا دیکھا کہ مچل گیا، قابو سے باہر ہوگیا، بیٹھے بٹھائے ایک آفت مول لی، اب ہر وقت اس کا خیال ہے اور اسی کا دھیان، حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے، طاقت شکیبائی رخصت ہو جاتی ہے، لاکھ کوشش کیجاتی ہے کہ کسی طرح دل کو تسکین و دلاسا دیا جائے لیکن سعی لاحاصل ہے دیکھئے شاعر نے اس چھوٹی بحر میں کس عمدگی کیساتھ اپنی حالت کا نقشہ کھینچا ہے واقعہ تو یہ ہے کہ اس سادگی میں وہ جاذبیت اور معنی آفرینی ہے کہ چوٹ کھائے ہوئے دل ہی اس لذت کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں، ملاحظہ ہو ؎

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا آہ۔ چپ بھی رہا نہیں جاتا

خودداری کا خیال بھی ایک پاکیزہ جذبہ ہے، وضعدار طبیعت آئین و ادب کا بیحد لحاظ رکھتی ہے لیکن جب دیوانے نے کسی کی نگاہ ناز کے کشتہ ہوئے اس وقت سے حالت بھی بدل گئی۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر روز کے آنے جانے سے عزت کم ہو جاتی لیکن اب دل کا معاملہ ایسا بیڈھب آپڑا ہے کہ ہر وقت کوئے جاناں کی چھاننے کی فکر ہے تاکہ رخ زیبا کا درشن ہو جائے، اسی تمنا میں بار بار جاتے ہیں، چکر لگاتے ہیں، اب نہ وہ وضعدار طبیعت رہی نہ وہ خودداری کا خیال، البتہ جب غیرت اس حرکت کی طرف توجہ دلاتی ہے تو یہ جواب دیدیا جاتا ہے کیا کریں کمبخت دل جو کچھ دکھائے اسے ناچار دیکھنا پڑتا ہے معلوم نہیں کہ یہ اور کس قدر ذلیل و رسوا کرے، اور جو اصول زندگی ——— ہم نے اپنے ذہن میں قائم کرلئے تھے ان کی شکست و خلاف ورزی پر آمادہ کرے ؎

ہردم آئینے میں بھی ہوں نادم کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

انسان کی زندگی عارضی ہے اور کل نفس ذائقۃ الموت " کے اصول کے تحت سب فانی ہیں لیکن نادان انسان اس سے غافل ہو کر اپنی اس دوروزہ زندگی میں بڑے بڑے منصوبہ سوچتا ہے اور وسیع و پختہ و سنگین عمارات بنواتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ ابھی

اس کی آرزو کبھی پوری نہیں ہونے پاتی کہ پیغام اجل آپہونچتا ہے ہم تو کس شمار و قطار میں ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہان عالیجاہ مثل جمشید و فریدوں کے بنائے ہوئے قصر ہائے فلک دوز آج سوتے پڑے ہوئے ہیں، در و دیوار شکستہ ہو چکے ہیں اور زبان حال سے درس عبرت دے رہے ہیں، ؎

بناوے کوئی عمارت سو کس توقع پر　　پڑا ہے قصر فریدوں بن آدمی سونا

نامراد عاشق کا محبوبۂ دلنواز کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہونا اصول عشق سمجھا گیا ہے دیکھئے اس زلف شبگوں جیسے پامال مضمون کو قایم نے کس شان سے باندھا ہے ؎

دل پا کے اس کی زلف میں آرام رہ گیا　　جس جا ہوئی عزیز کے تئیں شام رہ گیا

قیس و فرہاد، مجنوں و وامق۔ بہت سے عاشق دنیا سے نامراد اٹھے جس کسی نے اس کوچہ میں قدم رکھا وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا، ان کا سینہ حسرت و یاس کا مدفن بنا، آرزو و تمنا دل میں لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوا، یہ بیجد پرخار وادی ہے جس کسی نے اس کی طرف رخ کیا اپنے دامن کی دھجیاں بنالیں، محبت وہ بری بلا ہے کہ جان ہی لیکر چھوڑتی ہے، عشق کا کوچہ مردم کشی میں بہت بدنام ہے، جوانی دیوانی وہ غلا او رہکا کر اس کوچہ کی طرف لیجاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیست کی امید باقی نہیں رہتی ہے، شاعر نے اسی امر کو واضح کیا ہے ؎

قایم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری　　مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

زندگی میں کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ہونا چاہئے، ایک وارفتہ کیلئے تو اوقات گزاری کیلئے شغل کی اس سے زیادہ ضرورت لاحق ہوتی ہے، تازہ تازہ جب محبت کا آزار تھا اس وقت آنکھوں سے آنسوکی ندیاں بہا کرتی تھیں لیکن اب یہ خشک ہو چکی ہیں۔ اس لئے شاعر کہتا ہے ؎

بے شغل نہ زندگی بسر کر　　گر اشک نہیں تو آہ سر کر

ان لیٹرے بیوفاؤں کی حالت کس عمدہ پیرایہ میں بیان کی ہے جو مال و زر کے گرویدہ ہیں، انھیں محبت اور کسی کے خلوص سے کوئی غرض نہیں ہے ؎

اے دل برنگ غنچہ نہ مل گر خوش ہے تو　　اپنی گرہ میں اون کے کھلانے کو زر نہیں

کس قدر پاکیزہ شعر ہے، جذبات کو کس عمدگی سے ظاہر کیا ہے ؎

مجھے اس اپنی مصیبت سے ہی فراغ کہاں　　کسی سے چاہوں کہ صحبت رکھوں دماغ کہاں

ہماری گفتگو میں وہ اثر ہے کہ اچھے اچھے وحشی رام ہو جائیں اور ہمارا کلمہ پڑھنے لگیں، جس کسی نے ہماری باتیں سنیں وہ گرویدہ ہو گیا یوں کہئے کہ تسخیر قلوب کا یہ بہت اچھا نسخہ موجود تھا لیکن ستم تو یہ ہے کہ اس نسخہ کو آزمانے کا کمبخت نے موقع ہی نہیں دیا، ہماری طرف مخاطب ہی نہیں ہوا۔ بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ہماری بات سننا تک گوارا نہیں، ہم کو اپنی شومی قسمت ہی سے شکایت ہے ؎

سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں    لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ ہزاروں عشوہ و انداز سے دل تو لے لیا لیکن اب دل لینے کے بعد تیور ہی بدل گئے، سیدھے منہ بات تک نہیں کیجاتی ہے بلکہ جب ذرا اکجھ جاتے ہیں تو نہایت متانت سے کہتے ہیں کہ در عدالت کھلا ہوا ہے جاؤ اور فریاد کرو ؂

دل مرا چھین کے کہتا ہے وہ دلبر قایم    جی جہاں چاہے تمہارا مری فریاد کرو

دل چھیننے اور اپنے عشاق کے دایرہ کو وسیع کرنے کی خواہش فطری طور پر مہ جبینوں میں موجود ہوتی ہے، اُن کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ جو کوئی ان کے رُخ زیبا کی طرف نظر کرے، اُن کی نگاہ ناز کا گھائل ہو جائے، اُن کو اس میں بڑا مزہ آتا ہے کہ عشاق کیسا تھ اپنی تفریح طبع کے لئے چھیڑ چھاڑ جاری رہے، جب دیکھتی ہیں کہ کوئی حسن سے متاثر نہیں ہوتا تو ناز و ادا، عشوہ و کرشمہ اور کبھی عجز و نیاز اور کبھی خنجر ابرو اور تیر نظر سے کام لیتی ہیں، غرض مختلف حربوں سے آراستہ رہتی ہیں جو ایک حربہ سے کام نہ چلے تو دوسرے حربہ سے کام لیا جائے، ؂

ناز و ادا کہیں کہیں عجز و نیاز ہے    کس کس طرح سے یار مرا جلوہ ساز ہے

عاشق کی زندگی رنج و غم سے بھری ہوئی ہے، درد و الم، اور حزن و ملال کا ساتھ ہے، کشتیِ حیات تلاطم میں ہے، ہر وقت خطرہ کا خدشہ لگا ہوا ہے، صبح ہوتی ہے تو ایک تازہ مصیبت پیش آتی ہے اور شام ہوتی ہے تو ایک نئی آفت کا سامنا ہوتا ہے ؂

شام ہوتی نہیں اک دل پہ بلا آتی ہے    صبح ہوتی نہیں اک جی پہ غضب آتا ہے

وادیِ الفت کا ایک تجربہ کار سیاح اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر نوگرفتاران بلا کو یوں نصیحت کرتا ہے۔

مرجایئے کسی سے پر الفت نہ کیجئے    جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

ملاحظہ ہو کس بیساختہ پن کے ساتھ شکایت کی ہے، زبان کی سلاست، طرز بیان کی خوبی قابل داد ہے، شعر کیا ہے جذبات دلی کا مظہر ہے ؂

گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے    کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

دل وقف یاس و حرماں ہو چکا ہے، اور طبیعت رنج و غم سہتے سہتے مردہ ہو گئی ہے، عیش و عشرت کی ہوس ہے اور نہ محفل نشاط کی خواہش باقی ہے ؂

کسے گلگشت گلشن کی ہوس ہے    اسیری کا جگر پر داغ بس ہے

ناحق لوگوں نے گلشن کا تذکرہ چھیڑ دیا، بیچارا عاشق تو اسی حالت قفس میں مست تھا ؂

نہ پوچھو مجھ سے گلشن کی حقیقت    برس گزرے کہ میں ہوں اور قفس ہو

دنیاوی تعلقات انسان کو عقاید میں کمزور بنا دیتے ہیں جب تک کہ انسان کو ذات باری تعالی پر پورا بھروسہ نہ ہو اس کی نجات مشکل ہے، جب خالق مطلق اس کا ممد و معاون ہو تو پھر اوروں کے ناراض ہونے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا، ؂

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے / کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

دنیا میں ہر شخص اپنے ذاتی اغراض کی حصول میں کوشاں ہے، دوسروں کی فکر بہت کم کرتا ہے، جو ہے وہ مطلب کا بندہ ہے، ؎

کیا جانے ہم کہاں ہیں اور دین و دل کدھر ہے / عالم میں تفرقے کی کس کی کسے خبر ہے

خود تو تیر نگاہ کے گھائل ہو گئے لیکن ایسا سبق پایا کہ گھبرا اُٹھے، اب دعا کرتے ہیں کہ دوست، دشمن کو بھی اس سے سابقہ نہ پڑے ؎

یارب کوئی اس چشم کا بیمار نہ ہووے / دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے

آہ - دنیا میں کوئی مشفق و مساز اور رفیق غم گسار نہیں، اپنا حال زار کس سے سنایا جائے، یا تو درد سے دل ہی آشنا ہے یا پروردگار ہی کو اس کا علم ہے ؎

مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے / جو گزرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

شاعر کو خوف ہے کہ اُس کے ارادہ کی خبر پا کر لوگوں کو کہیں غلط فہمی نہ ہو، اس لئے وہ اپنی نیک نیتی کا اظہار کرتا ہے تاکہ اس سے واقف ہو کر ان کی بدگمانی دور ہو جائے ؎

بتوں کی دید کی جاتا ہوں دیر میں قائم / مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

دنیا میں عدل و انصاف کا وجود نہیں ہے، کرتا کوئی ہے اور خمیازہ بھگتتا ہے کوئی اور بقول کسی کے "کرے ڈاڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا" جرم کا ارتکاب تو ایک شخص کرتا ہے لیکن سزا ایک ناکردہ گناہ کو دی جاتی ہے، یہی آئین جہاں ہے ؎

تجھ سو لگیں تھیں آنکھیں پھنسا مفت میں دل / تقصیر تھی کسو کی گرفتار ہے کوئی

جور و الم سہتے سہتے دنیا سے طبیعت اکتا چکی ہے، دنیا سے خوش معاملگی مفقود ہو چکی ہے، دغا و فریب کی گرم بازاری ہے، دیدہ دلیری تو دیکھئے کہ ایک چیز لیتے ہیں لیکن پھر نہایت سادگی و بے پروائی کیساتھ انکار کر جاتے ہیں ؎

جی بچ چکا ہے جور فراموش کے ہاتھ سے / دل دیکھنے کو لے کے جو ظالم مکر گئے

جو چیز مفت ملجائے اس کے قبول کرنے سے انکار نہیں ہوتا، گو میخواری سے توبہ کیجا چکی ہے لیکن ابتک ہونٹ اس لذت کا مزہ لے رہے ہیں، اس لئے شراب مفت ملجائے تو انکار نہیں ؎

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن / بے طلب بھی جو ملجائے تو انکار نہیں

چھپ چھپ کے غیر سے ملنے کی شکایت کی تو ایک ادا کے ساتھ پوچھا کیا تم نے خود دیکھا، ان کا خیال ہے کہ میں اس کا ثبوت دینے سے قاصر رہوں گا، لیکن بھلا کہیں عاشق سے محبت کی نظریں بھی چھپ سکتی ہیں، اس کا جواب یہی ہے کہ ذرا اپنی آنکھوں طرف دیکھو ؎

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی / سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

پیدائش اور عطائے حیات سے انسان اعمال کی سزا و جزا کا ذمہ دار ٹھیرا، کاش کہ پیدا ہی نہ ہوا ہوتا اور ہمیشہ عدم ہی میں رہتا تو پھر یہ پرسش اور ثواب و عذاب کا مسئلہ ہی درپیش نہ ہوتا، عدم کی زندگی تفکرات اور خیر و شر کی پرسش سے پاک و مبرا تھی،

جب خلعت ہستی عطا ہوا اور کتم عدم سے دنیا میں اس کا ظہور ہوا تو پھر علایق دنیوی کی زنجیر پاؤں میں پڑ گئی ؎

تھا بدونیک جہاں سے میں عدم میں آزاد آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھکو

ہجر و فراق کی گھڑیاں کبھی تارے گن گن کر کروٹ بدلتے گزاریں، خیال یار کوئی وقت ہم سے جدا نہیں رہا، دل میں ایک ٹھیس لگتی ہے اور ہم با چشم پر نم محبوب کا تصور کر کے دل کو ڈھارس دیتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ اے دل اس قدر مضطرب نہ ہو وہ بھی مجھ سے غافل نہیں ہے، تیری محبت میں وہ بھی بیقرار ہے، ایسی حالت میں جب ہچکی آجاتی ہے تو ہم کہکر دل خوش کر لیتے ہیں کہ اس نے یاد کیا ہے، محبت کے اثر سے اس کا جگر بھی پارہ پارہ ہے، ہندوستان عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب ہچکی آتی ہے اس وقت جسکا یاد کرنا قرین قیاس ہو اس کا نام لیا جائے تو ہچکی بند ہو جاتی ہے اسی کو شاعر نے اس طرح ظاہر کیا ہے، ؎

ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا ہچکی گر آئی تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

شباب کا پر کیف منظر ولولہ اور جوش و خروش سے مملو ہوتا ہے امنگ اور حوصلے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اس عہد کے اعمال خدائے پاک ——— نزدیک بھی زیادہ قابل قبول ہیں جوان صالح کی دعا کے استقبال کے لئے اجابت در حق سے پیشقدمی کر کے آتی ہے، تخم ریزی کا اصلی زمانہ یہی ہے، اس عہد میں جیسے اعمال کئے جائیں اس کا نتیجہ ہم کو بعد میں اٹھانا پڑتا ہے، شاعر اسی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے نصیحت کرتا ہے کہ انسان اس زمانہ میں غافل نہ رہے ؎

نیک و بد جو تجھے کرنا ہی سو کر لے قایم پھر یہ امید نہیں ہے کہ جواں ہوئے گا

معشوق کی بیوفائی اور عاشق سے بے اعتنائی و کج ادائی کوئی نئی بات نہیں ہے دل لیکے مکر جانا اور ستم زدہ کو جلانا اور اسکی دل آزاری کرنا یہ تو اس کا معمولی کام ہے بے رخی اور تغافل اسپر قیامت ہے، خصوصاً دل دکھانے کے اور عاشق کو جلانے کیلئے غیر سے ملنا اور ہنسکر باتیں اور اس سے محو اختلاط ہونا عاشق ناکام کے دل پر بجلیاں گراتا ہے مگر بے بس عاشق اپنی قسمت پر قانع ہو کر خاموش رہجاتا ہے اپنی حرماں نصیبی پر اشک غم بہاتا ہے، لیکن دیکھنے والے غیر لوگ کیسے خاموش رہتے انھوں نے چہ می گوئیاں شروع کیں، شاعر نے اسیطرف اشارہ کیا ہے ؎

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے پر سنا ہو گا کہ سنکر اک جہاں نے کیا کہا

عہد و پیماں مکمل ہو چکے، ملنے کا وقت بھی مقرر ہو گیا دل پر ارماں مسرور و شاداں ملاقات کے لئے چلا ہے، لیکن وائے قسمت برگشتہ کہ جب آرزوئے دیرینہ کی تکمیل کا وقت آیا تو ——— ہماری ازلی بدنصیبی رنگ لائی جب کہ ہم در جاناں کے بالکل قریب پہونچ چکے تھے کہ ہم کو بصد یاس و حسرت ناکام واپس ہونا پڑا اس دل خون شدہ کی کیفیت یقینی بیحد قابل تاسف ہے جو کامیابی سے ہم آغوش ہوتے ہوئے یوں ناکام رہگیا ہو ؎

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

کسقدر حسرت و یاس کا مرقع ہے، دلگیر اور ستم زدہ عاشق کی دردناک حالت کا منظر ہے، سادگی اور طرز بیان کی دلنشینی قابل داد ہے۔

ملاحظہ ہو ؎

لے گیا خاک بھی ہمراہ دل اپنے قایمؔ شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

کوشش اور سعی بہت کچھ کر دیکھی لیکن مطلب برآری نہ ہوئی، کبھی ناراض ہوے، کبھی نہ ملنے کی قسم کھالی، کبھی یہ عہد کر لیا کہ پھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھیں گے، لیکن اس قسم کے عہد پر بھی کہیں کوئی قایم رہ سکتا ہے۔ نظر سے دور ہوے کہ پھر دیدار جاناں کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا، ناچار اعتراف شکست کرتے ہوئے پھر در جاناں پر حاضر ہوئے بہتری کوشش کر دیکھی لیکن دل سے خیال یار کو جدا کرنے میں کامیابی نہ ہوئی، اور ادہر وہ ستمگر ہے کہ کسیطرح پسیجتا ہی نہیں، کسی ترکیب کا اسپر کوئی اثر نہیں ہوتا، اس کی بے اعتنائی میں کوئی فرق نہیں آیا، آخر کار بد نصیب عاشق مجبور ہو کر اسی کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر روٹھا تھا آپ تجھ سے میں اور آپ من گیا

معرکہ حسن و عشق تو ہمیشہ گرم رہتا ہے، تکرار اور جھگڑا تو امور روزانہ میں داخل ہو گئے ہیں، ادہر سے اصرار ہے اور ادہر سے شان استغنا، آخر دونوں کا نباہ کس طرح ہو تیز گفتگو اور ناراضگی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے وہ تند خو جلد بگڑ بیٹھتا ہے، محبت کی جنگ بھی عجیب منظر پیش کرتی ہے، آخر کار اس روزانہ کشمکش نے انتہائی صورت اختیار کی اور ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد صلح ہو گئی، ؎

قایم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سی صلح مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دہو چکا

اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی جو نہایت قدیم زمانہ سے فقر و تصوف کا مرکز ہے اس لئے ابتدا ہی سے اسمیں صوفیانہ خیالات کی آمیزش ہو گئی، رفتہ رفتہ صوفیانہ شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوئی، لیکن جس زمانہ میں اردو شاعری ہوئی تو خواجہ میر درد نے سب سے پہلے اس زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا، چنانچہ خود فخریہ کہتے ہیں، ؎

پھولیگی اس زبان میں گلزار معرفت یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا۔

چنانچہ اس دور کے تمام شعرا مثلاً میر، سودا، اثر، میر حسن، قایم کے کلام بھی صوفیانہ خیالات سے لبریز ہیں، متوسطین نے جس وسعت اور دلاویزی کے ساتھ صوفیانہ خیالات کو ادا کیا ہے، اس کی نظیر کسی اور دور میں نہیں ملسکتی،

ہم ذیل میں قایم کے اشعار چند عنوانوں کے ماتحت درج کرتے ہیں[1]:۔

جزو و کل کے فرق پہ مت جا اک آتش کو دیکھ ہر جو تودہ میں ہی ذرہ سی چنگاری میں ہی

---

کیوں چھوڑتے ہو درد تہ جام میکشو ذرہ ہے یہ بھی آخر اوسی آفتاب کا

---

اوس سرے ہستی تک اپنی تفرقہ یک مو نہیں نقطہ و خط دو ہیں جو الہ بیٹھ لیکن دو نہیں

---

[1] یہ تمام عنوانات معہ اشعار مولانا عبد السلام ندوی کی شعر الہند حصہ دوم سے نقل کئے گئے ہیں

**عظمت انسان**
پر فرشتے کے اس جگہ جل جائیں — جس طرف ہم گزار کرتے ہیں

---

جس سے گردش میں ہیں خم افلاک — اس مے تند کا ایاغ ہوں میں

---

گر فخر ہے تو مجھ سے دگر عار ہے مجھ سے — ہر جنس کی یاں گرمی بازار ہے مجھ سے
احساس نہیں خلق کی نظروں میں وگرنہ — جوں شمع یہ سب بزم نمودار ہے مجھ سے
جوں رشتہ تو کمزور سا مت دیکھیو مجھکو — مضبوطی ہر سبحہ و زنار ہے مجھ سے
حیران و گیا راکع و ساجد ہیں نہ بیجا — ہر بے خبر خلق خبردار ہے مجھ سے

---

**انسان خدا کا پرتو ہے**
ہوتے تھے محال ہو ہم درمیاں نہوں — جبتک وجود شخص ہو سایہ نہ جائے گا

---

**انسان کامل نایاب ہے**
یوں آدمی کہلائے ہر گربہ و سگ لیکن — جس سے کہ عبارت ہو انسان وہ عنقا ہے

---

**سیر عالم النفس**
جز سیر دل اب اور کتابت نہ سبق ہو — جی لگے ہو جمیں وہ یہی ایک ورق ہو

---

موج گرداب کی طرح ہم نے — گھر سے باہر کبھو سفر نہ کیا

---

گیا نہیں ہوں میں یاں اس طریق سے قایم — کہ جستجو سے کوئی پا سکے سراغ مرا
**محاسبہ نفس** — محاسبہ سے وہ صبح جزا کے ایمن ہیں — جو آپ روز و شب اپنا حساب لیتے ہیں
**تحفظ نفس** — دوس کیا دیجئے چور کو قایم — بند گھر کا میں آپ در نہ کیا
**عظمت قلب** — خدمت دیر و حرم کی جو میں یک عمر تو کیا — در گہ دل میں تو ابتک شرف اندوز نہیں
**انتشار قلب** — آیا ہوں پارہ دوزی دل سے نپٹ پہ تنگ — ایسے پھٹے ہوے کو میں کبتک رفو کروں
**مرشد کی ضرورت اور اسکا اثر** — ہو نہ مجھ سے جدا کہ جادہ صفت — منزل عشق کا سراغ ہوں میں

---

اس کا وہ منظر جس بانڈھ ہو کوئی گلدستہ — گو ہیچ ہوں پر مجھ سے عجب دل لگا ہے

راہ سلوک کی افسوسناک ناکامی:۔ قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند　　دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے

عشق حقیقی ا　ہمت عشق نہ ہو حسن خط و خال میں بند　　صید ہر مور و مگس ہوتے ہیں شہباز کہیں

عشق حقیقی میں تن آسانی چھوڑ دینی چاہئے:۔ تن آسودہ کم لیتے ہیں بازار محبت میں　　جو واں چاہے تو ٹوٹا دل کوئی یا چشم تر لیجا

ترک خودی ا۔　اپنے ہی ہونے کے یہ سب الجھاؤ ہیں ورنہ　　اس راہ میں ہم نے تو کہیں دام نہ پایا

---

ترک کر اپنا بھی کہ اس راہ میں　　ہر کوئی شایان رفاقت نہیں

دیدار الٰہی انسان کو خود گم کر دیتا ہے:۔ کھولی جو چشم دید کو تیری یہ جوں حباب　　اپنے تئیں میں آپ نہ آیا نظر کہیں

رضائے الٰہی ا　کیا ساغر ہلاہل و کیا جام آب خضر　　آجائے بزم دوست میں جو کچھ سو پیجئے

---

کشاکش موج سے کرنا کوئی مقدور ہے خس کا　　میں اور تیری رضا پیارے جدھر چاہے اُدھر لیجا

عالم مثال ا　کہتا ہے آئینہ کہ ہو تجھ سا ہی ایک اور　　باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں

قیود مذہبی سے آزادی ا　قایم یہ جی میں ہے کہ تقید سے شیخ کے　　اب کہ میں جو نماز کروں بے وضو کروں

---

سبھی بندے تو خدا کے ہیں پر اتنا ہے فرق　　تو گرفتار تعین ہے ہم آزاد ہیں شیخ

اخلاقی شاعری ا　اس کے تحت قایم نے صرف ایک عنوان "علوئے ہمت" کے ماتحت کہا ہے ؎

علوئے ہمت ا　دو جہاں بھی ملیں تو بس ہے ہمیں　　یاں کچھ اتنی تو احتیاج نہیں

---

فلک جو دے تو خدائی بھی لے نہ اب قایم　　وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

قایم کو ہم ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتے تاہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کے کلام میں جابجا فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں چنانچہ ذیل میں چند اشعار درج کرتے ہیں۔

حقیقت عالم ا۔ حقیقت عالم کے متعلق فلسفیوں میں سخت اختلاف ہے، ایک گروہ کہتا ہے کہ کوئی چیز اصلی نہیں جو کچھ ہم کو نظر آتا ہے وہ توہمات و خیالات ہیں ہمارے شعرا نے زیادہ تر اسی خیال کو ظاہر کیا ہے، چنانچہ حضرت خواجہ میر درد فرماتے ہیں ؎

مت جا تر و تازگی پہ اس کے　　عالم تو خیال کا چمن ہے

قایم کہتے ہیں ؎

یہ نیست و ہست اے دل سب ہم ہی سے ہے ورنہ　　جب تھا کچھ تو کیا تھا اور اب نہیں تو کیا ہے

اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر قایم یہ کہتے ہیں کہ عالم ایک راز سربستہ ہے، ہم سے یہ معمہ حل نہیں ہو سکتا، چنانچہ اسی خیال کو ظاہر کیا ہے ؎

بہت سا غور کو مت دخل دے نسخے میں عالم کے ۔۔۔ کہ حاصل دور ہے نظر دل ہے تیری اس رسالے کا

بظاہر نظام عالم میں سخت ناہمواریاں اور بے ترتیبیاں پائی جاتی ہیں لیکن درحقیقت دنیا کا ایک ایک ذرہ ترتیب و تناسب کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ دنیا کے ایک ذرہ کو بھی ٹھیس لگا کر اپنے مرکز سے ہٹانا نہیں چاہتے بلکہ ہر شخص کو یہ فلسفیانہ مشورہ دیتے ہیں ؎

غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کر یہاں ۔۔۔ ہر سنگ رہگذر کا دوکان شیشہ گر ہے

قدم مادہ :۔ فلسفہ کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ مادہ عالم قدیم ہے تغیر و زوال جو کچھ ہوتا ہے صورت میں ہوتا ہے، مادہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہتا ہے ۔ قایم نے اس خیال کو نہایت وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا ہے ؎

وہی معنی ہیں گو دہو کا ہے صورت کے ازالہ کا ۔۔۔ اگر ژالہ ہو پانی سے دگر پانی ہو ژالہ کا

---

گئی نہ ہم سے اضافت وجود کی کہ ہم اب ۔۔۔ جو خود نہیں تو ہمارا غبار باقی ہے

**فطرت بدل نہیں سکتی** | بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ بعض اشخاص کی فطرت بدل جاتی ہے مثلاً نیک آدمی بد اور بد آدمی نیک ہو جاتے ہیں لیکن یہ فطرت کا تغیر نہیں بلکہ مناسب اوقات میں فطرت کا ہی ظہور ہے خود انسان کی فطرت میں نہ کبھی تغیر ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے، چنانچہ اسی خیال کو قایم نے زیادہ شاعرانہ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے ؎

ہوس سے ہم کیا تھا عشق اول ۔۔۔ وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

**دنیا میں رنج ہی رنج ہے** | دنیا میں اگرچہ خوشی کا حصہ رنج پر غالب نظر آتا ہے لیکن بعض فلسفیوں کو دنیا میں رنج نظر آتا ہے چنانچہ قایم کہتے ہیں ؎

غم یہ ہستی کی ہے بنا کہ حباب ۔۔۔ دل کے کھلتے ہی یاں تمام ہوا

**انسان کو صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا** | انسان کو زیادہ تر علم حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن حواس کی شہادت بعض فلسفیوں کے نزدیک معتبر نہیں اس لئے اُن کے نزدیک انسان کو صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا، قایم فرماتے ہیں ؎

اس کو نہ راست کہہ تو نہ اسکو بتا غلط ۔۔۔ کیا جانے کیا صحیح ہے واقع میں کیا غلط

**نیکی صرف مذہب میں محدود نہیں** | اگرچہ انسان صرف مذہب ہی کو تمام خوبیوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے لیکن خوبی صرف مذہب ہی میں محدود نہیں بلکہ اور چیزوں میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے انسان کو ہر جگہ خوبی کی تلاش کرنی چاہئے ؎

صرف کفر و دیں پہ کیا ہے منحصر ۔۔۔ ہاں دلا خذ ما صفا دع ما کدر

**نیکی اور بدی فطرت کا نتیجہ ہیں** دنیا میں نیکی اور بدی کا جو سلسلہ نظر آتا ہے اس کو دیکھکر بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ بدی کی کیا ضرورت تھی خدا خیر مجسم ہے، وہ صرف بھلائی ہی بھلائی کو پیدا کر سکتا تھا، لیکن در حقیقت نیکی کی طرح بدی بھی خدا کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے اس لئے نیکی کی طرح وہ بھی ایک فطری چیز ہے، قایم کہتے ہیں ؎

بھلا ہم رند زاہد تجھ سے نیکو کار کیونکر ہوں ظہور مختلف کو چاہیئے ہے شانِ خلاقی

**برائی اور بھلائی فرضی ہیں** دیو جانس کلبی برائی اور بھلائی کو محض اعتباری اور فرضی چیز خیال کرتا ہے اس لئے وہ کسی رسم و رواج کا پابند نہ تھا، قایم نے اسی خیال کو اس شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

فارق نیک و بد دہر ہے تیرا پندار ورنہ کچھ فرق نہیں شنبہ و آدینہ میں

**خیر و شر اضافی ہیں** دنیا میں خیر و شر کا حقیقی وجود نہیں بلکہ جو چیز ایک شخص کے لئے مضر نظر آتی ہے وہ دوسرے کے لئے مفید ہو سکتی ہے اس فلسفہ کو اس طرح بیان کیا ہے :-

خیر و شر کو تو سمجھ نادان کہ آب خاک کو نافع ہے آتش کو مضر

دیکھ سرسری اوراق گل کہ یہاں قایم ہے شرح تنگی غنچہ فراغ میں گل کے

**برائی کے پیدا کرنے کی مصلحت** برائیوں کے پیدا کرنے کی مصلحت یہ ہے کہ اُن کے مقابل میں جو بھلائیاں ہیں وہ زیادہ روشن اور نمایاں ہو جائیں جب اندھیرا نہ ہو روشنی کا لطف حاصل نہیں ہوتا ؎

موقوف ضد ہی پر تو ہر شے کی معرفت کچھ کفر بھی ضرور ہے اسلام کے لئے

عبرت پذیری کے ذریعہ جو انسان کی اخلاقی اصلاح ہوتی ہے وہ بھی انہیں برائیوں کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ایک آدمی برا کام کرتا ہے تو اس کے انجام بد سے واقف ہو کر سیکڑوں آدمی احتراز کرتے ہیں ؎

آوارہ کر چمن میں مرے بال و پر نسیم آئندہ تا نہ ہووے کوئی مبتلائے گل

**تربیت کے لئے جلدی مضر ہے** دنیا کے لئے ہر چیز بتدریج ترقی کرتی ہے اس لئے تربیت میں جلدی نہیں کرنا چاہئے ورنہ لازمی طور پر خامی رہجائیگی، چنانچہ قایم کہتے ہیں ؎

ناپختگی کا اپنے سبب اس ثمر سے پوچھ جلدی سے باغبان کی جو خام رہ گیا

**محقق مقلد نہیں ہو سکتا** تقلید صرف عوام کے لئے ضروری ہے، محققین کو تقلید نہیں کرنی چاہئے چنانچہ قایم فرماتے ہیں ؎

جنھیں کچھ سلسلہ میں عشق کی تحقیق حاصل ہے وہ کب مجنوں سے ہر گمراہ کی تقلید کرتے ہیں

**گردش زمانہ کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہئے** زمانہ کے حوادث ایک بحر ذخار کی طرح موجیں مارتے ہوئے چلے آتے ہیں اور ان کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی اُن کو اپنی رو میں کسی کے نفع و نقصان کی پروا نہیں ہوتی، اس لئے انسان کا فرض صرف یہ ہے کہ ؎

خس نمط ساتھ موج کے لگ لے بھتے بھتے کہیں تو جاوے گا

**تجربہ** انسان کو صرف تجربہ ہی تمام خطرات سے بچا سکتا ہے چنانچہ قایم کہتے ہیں ؎

ضائع نہ کر تو دام ہیں صیاد دانہ کو دیکھا ہے لاکھ رنگ سے ہم نے زمانہ کو

**خمریات** عربی شاعری میں اخطل اور ابو نواس اور ایرانی شعرا میں خیام اور حافظ نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے، اردو شاعری میں میر، سودا، نظیر و میرحسن نے بھی اس طرف توجہ کی لیکن دور تغزل کے بعد جب معاملہ بندی کے ساتھ رندی و ہوسناکی کا دور شروع ہوا تو آتش اور تلامذۂ آتش نے اس قسم کے خیالات کو زیادہ شوخ کیا، غالب عموماً شراب نوشی کیا کرتے تھے اس لئے انھوں نے بھی اس صنف میں نہایت مستانہ اور پرجوش اشعار کہے اور متاخرین میں داغ و ریاض نے بھی اس میں نمایاں شہرت حاصل کی شاعرانہ حیثیت سے اس صنف کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ اشعار برجستہ، صاف، رواں اور مستانہ ہوں، اور طرز ادا میں جوش اور الفاظ میں طرب انگیزی اور رنگینی پائی جاتی ہے، قایم نے اس صنف میں بھی کہا ہے ؎

آج دل میں ہے کہ کھلکر مے پرستی کیجئے خوب مے پیجئے اور دیر مستی کیجئے

---

سحر ہوئی، رات بیتی موہے شیشہ میں ہے تی اور کاسا دنا ولہا الا یا ایہا الساقی

---

قایم فارسی زبان میں بھی فکر سخن کیا کرتے تھے، اس وقت ملک کی عام زبان فارسی تھی، خط وکتابت، مراسلت، تصنیف وتالیف بھی اسی زبان میں ہوا کرتی تھی، اردو میں تصنیف کرنا معیوب سمجھتے تھے ابھی حاتم نے اردو کی عام ترویج کی طرف توجہ نہیں کی تھی، عام طور پر شعرا بھی اسی زبان میں اشعار کہا کرتے تھے، چنانچہ فارسی زبان میں بھی قایم کے چند اشعار موجود ہیں نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم نے اپنے تذکرہ "بزم سخن" میں قایم کے فارسی کے دو شعر نقل کئے ہیں، ؎

آنانکہ با حلاوت درد تو خو کنند زخمی بدل زنند و نمک آرزو کنند

---

شب کہ انداز ہم آغوشی او یاد کنم خویش را تنگ ببر گیرم و فریاد کنم

اس وقت کے اکثر شعرا قایم کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں، اکابر شعرا نے جو بجائے خود استادان فن تھے نہایت بلند آہنگی کیساتھ قایم کی استادی اور قادر الکلامی کا اعتراف کیا ہے، کئی ایک نے اشعار میں اس جذبہ کو ظاہر کیا ہے اور سودا، درد و میر کے ہم رتبہ قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ ان تینوں استادان وقت کی استادی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، ان کے ساتھ قایم کو شریک کرکے انھوں نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قایم کو وہ کس درجہ اور مرتبہ کا شاعر خیال کرتے تھے، چنانچہ ان اشعار کے پڑھنے کے بعد قدیم کی علو مرتبت کے بارہ میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ہے، میر باقر حزیں، مرزا جان جاناں کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے، سودا نے ان کا نام اکابر شعرا کے ساتھ لیا ہے، وہ اپنے احساسات اور جذبات قلبی کو یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

بزم شعرا کے جو ہیں صدر نشیں　　　داغ ہوں ان سے اب زمانے میں
یعنی سودا و میر و قایم و درد　　　لے ہدایت سے تا کلیم و حزیں

منشی قدرت اللہ شوق اسی عہد کے ایک قادر الکلام شاعر تھے جن کی تصنیفات سے ایک تذکرہ "طبقات الشعرا" یادگار ہے، وہ بھی اساتذۂ وقت کی مدح و شان میں یوں گہر افشانی کرتے ہیں ؎

اے شوق تیرے شعر کی ہو تو بڑی ہے دھوم　　　سودا و میر و قایم و درد و الم تلک

## تصنیفات

قایم کی تصنیفات سے ایک کلیات اور ایک تذکرہ یادگار ہیں، کلیات کے قلمی نسخے ہندوستان میں بعض حضرات کے ہاں موجود ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمیں کوئی نسخہ دیکھنے کے لئے نہیں ملا ورنہ ہم تفصیل کیساتھ اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے اور مصحفی کے قول کی تائید میں ہم مختلف اصناف سخن کے نمونے پیش کرتے جس سے ناظرین کو قایم کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق اندازہ کرنے میں بہت آسانی ہوتی، تاہم انڈیا آفس کی فہرست ہندوستانی کتب میں بلوم ہارٹ نے ایک کلیات کی موجودگی کا ذکر کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ کلیات کا آغاز مذکورۂ ذیل اشعار حمد سے ہوا ہے ؎

ہرگز نہیں مقدور تری حمد زباں کا　　　برہان ہے دعوے کے مرے عجز بیاں کا
جبتک کہ ہو تو ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ　　　جو موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا
اے عشق میرے دوش پہ تو بوجھ رکھ اپنا　　　ہر سر متحمل نہیں اس بار گراں کا

یہ کلیات مجموعہ ہے غزلیات، مخمس، واسوخت، رباعیات اور قصیدوں کا، اور اس میں بادشاہ دہلی، وزیر، میر بخشی، امیر الامرا نعمت خاں، سودا، نواب عنایت خاں، نواب محمد یار خاں، نواب ہزبر جنگ، نواب نصر اللہ خاں کی شان میں قصاید ہیں، مثنویاں خصوصاً ہجویہ اور مختصر حکایتیں ہیں، ایک مثنوی کا عنوان "رمز الصلات" ہے اور اس کلیات میں سب سے آخری مثنوی "حیرت افزا" ہے جس کے آخری شعر سے تاریخ تصنیف دیوان یعنی ۱۱۹۳ھ (م ۱۷۷۹ء) برآمد ہوتی ہے ؎

ہوا ہے جس سن میں یہ نامہ مرتسم　　　ہے بارہ سو ہجری میاں سات کم

بلوم ہارٹ لکھتا ہے کہ اس نسخہ میں مثنوی "بشارت سرما" اور مثنوی "عشق درویش" شامل نہیں ہیں البتہ اس کا ذکر گارساں دی تاسی نے کیا ہے، "تذکرۂ مخزن نکات" یہ تاریخی نام ہے اسپرنگر نے تاریخی قطعہ بھی لکھا ہے، اس کتاب کے عنوان سے تاریخ تصنیف یعنے ۱۱۶۸ھ (۱۷۵۴-۵۵ء) برآمد ہوتے ہیں، ایتھے لکھتا ہے کہ "ریختہ گو شاعران قدیم کا یہ ایک زبردست قابل قدر تذکرہ ہے" یہ تذکرہ فارسی میں لکھا گیا ہے، سب سے عجیب بات اس تذکرہ میں یہ ہے کہ قایم اس بات کا مدعی ہے کہ وہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانی شعرا کا یہ تذکرہ لکھا، اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ میر کے نکات الشعرا، فتح علی حسینی گردیزی کے تذکرہ کے وجود سے لاعلم تھا، بلکہ وہ لکھتا ہے کہ اب تک ریختہ گو شاعروں کا کوئی تذکرہ ہی مرتب نہیں ہوا، چنانچہ وہ اس اولیت پر فخر کرتا ہے مگر ہمیں اس بیان کی صداقت پر شبہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے، مگر اس کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، بقول ڈاکٹر اسپرنگر "بلاشک وشبہ

اس تصنیف میں بہت کچھ اور تکمیل مواد ہے"

ایک بات جو اس کے قبل کے تذکروں میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ قایم نے سعدی شیرازی کو ہندوستانی شعرا میں شمار کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ سعدی کے متعلق اور تذکروں کی طرح قایم کو بھی مغالطہ ہوا، سعدی شیرازی نہیں بلکہ سعدی دکھنی ہیں یا بقول مولوی عبدالحق صاحب یہ سعدی شمال ہند کے باشندہ ہیں، اس بیان کی میر اور فتح علی گردیزی نے تردید کی ہے،

گارسان دی تاسی نے اپنی کتاب "ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف" میں جہاں پر ساتویں تذکرہ کا ذکر کیا ہے وہاں لکھتے ہیں کہ "قایم نے جو ایک مشہور شاعر ہوا ہے ایک تذکرہ لکھا ہے اس کا نام بھی نکات الشعرا ہے جو علاوہ اس کے طبقات الشعرا کے نام سے بھی معروف ہے اور اس کے بعد جہاں نویں تذکرہ کے متعلق لکھا ہے وہاں لکھتے ہیں" مخزن نکات، قایم کی تالیف ہے ان کے بیان کے مطابق ہر دو تذکرے تین طبقوں پر منقسم ہیں ہم کو جہاں تک علم ہے، عام طور پر تمام تذکرہ نویسوں نے صرف قایم کے تذکرہ "مخزن نکات" کا ذکر کیا ہے، ممکن ہے کہ یہ دونوں نام اصل میں ایک ہی تذکرہ کے ہوں، اور گارسان دی تاسی کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

اس تذکرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے۔

رنگینی کلمات و دلنشینی فقرات بحمد سخن پناہی ست کہ بنائے الخ...."

کل شاعر جن کی تعداد اس میں درج ہے ایک سو دس ہے، یہ تذکرہ تین طبقوں پر منقسم ہے،

طبقہ اول، دربیان اشعار متقدمین، ابتدا سعدی سے ہوئی ہے اور اختتام میر جعفر پر ہوا ہے

طبقہ دوم، در ذکر کلام سخنوران متوسطین، ابتدا شاہ مبارک آبرو سے ہوئی ہے اور اختتام افغان کتریں پر ہوا ہے،

طبقہ سوم، دربیان اشعار و احوال شعرائے متاخرین، ابتدا میر شمس الدین فقیر سے ہوئی ہے اور اختتام قایم پر ہوا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر اس تذکرہ کے متعلق یہ رائے دیتا ہے "تاریخ ادبیات اردو کے متعلق یہ ایک قدیم اور نہایت قابل قدر تصنیف ہے۔"

شاعر کی تاریخ وفات کے متعلق بھی بیحد اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ ۱۲۰۷ھ میں اور کوئی کہتا ہے کہ ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا، بہرحال ۱۲۰۷ھ اور ۱۲۱۰ھ کے درمیاں سفر آخرت کیا، شعرا و سخن فہموں کو اس کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا چنانچہ جرأت نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

جرأت نے کہی رو کے تاریخ وفات یکتائی کی تھا　　قایم بنیاد شعر ہندی رہ گیا کہئے اب آہ

**تلامذہ**

نواب محمد یار خاں امیر، فرزند نواب علی محمد خاں، اور نواب فیض اللہ خاں رئیس رام پور کے چھوٹے بھائی تھے، ٹانڈہ کی بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا، مرہٹہ گردی میں پریشان حال ہو گئے، فیض اللہ خاں رام پور لے گئے پچاس ہزار روپیہ جیب خرچ کے لئے مقرر کر دیا، ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی،

مولف طبقات الشعرا لکھتا ہے۔

جوانے بود مرزا منش، نازک طبع، صاحب فطرت، اہل مروت، عالی حوصلہ، خوش سلیقہ، حاتم زمانہ در سخاوت و جرأت یگانہ،

مجمع مکارم اخلاق و نبیض رسانی و قدردانی شہرہ آفاق و در فن موسیقی کہ بحریست ذخار و محیطے است ناپیدا کنار چناں دسترس تمام داشت کہ فیثاغورس باوجود استادی یکے از شاگردان ابجد خوانِ او، و تان سین نایکان دکھن از مدح سرایان او بسیار سخن فہم، نکتہ سنج، قدردان سخن استادان ایں فن در فرقہ اہل دل و شخصے بود بے بدل، گاہے طیب صفائی ذہن و جودت طبع برائے تفنن خاطر بفکر شعر ریختہ، می پرداخت و داد سخنوری و خوش تلاشی میداد و در اندک ایام مشقے او برتبہ عالی استاذاں رسیدہ بود فاما اجلش مہلت نداد"

حباب آسا نہ دیکھیں آنکھ اوٹھا اسباب دنیا کو ۔۔۔ لیا ہے کاسۂ سر سے جنھوں نے کام افسر کا

---

یاد کرنا ہی مرا آپ کو منظور نہ تھا ۔۔۔ گو کہ شب تھی پہ میں اتنا بھی تو کچھ دور نہ تھا

(۲) عباس خاں، عباس،

مولف طبقات الشعرا لکھتا ہے :- برادر خورد آخوند زادہ ارادت خاں کہ از مصاحبان نواب عنایت اللہ بود، جوانے است عالی حوصلہ، خوبصورت، پاکیزہ سیرت،

با تمکنت و وقار بسیار وجیہ و بردبار و حسین و نہایت خوش تلاش، خوش فکر و ذہین است، اگرچہ نومشق ست ذہن رسا و فکر بجا دارد"

جو عشق و سوز دیر و کعبہ سے کام ہے ۔۔۔ اس کو تو رام رام اور اس کو سلام ہے

تیرے بن اب جو دم ہے یا کہ ایک لحظہ ہے یا ساعت ہے ۔۔۔ بلائے جاں ہے، آفت ہے، اذیت ہے، مصیبت ہے

(۳) پروانہ علی، پروانہ مرادابادی،

مولف طبقات الشعرا لکھتا ہے :- مردے است دیوانہ، جوانے است مردانہ مزاج آزادانہ، مشرب رندانہ، ذہنش مناسب و موزوں شاعرانہ، شعر را باواز بلند میخواند، شاگرد مراد علی حیرت حالا از قایم مرقوم اصلاح میگرفت، دریں ایام جوش جنوں بر خاطرش طاری است ؎

جھوٹ کہتا ہے تو قاصد یہ زبانی پیغام ۔۔۔ مجھکو باور نہیں جب تک کہ نشانی آوے

(۴) قدرت، تخلص، مولوی قدرت اللہ نام، ساکن رام پور، عبدالغفور خاں نساخ لکھتے ہیں کہ ریختہ گویوں کا ایک تذکرہ اُن سے یادگار ہے ؎

لاکھوں جلائے مردہ صد سالہ آن میں ۔۔۔ فیضِ دم مسیح ہے اس کی زبان میں

انصاف بھی ضرور ہے یہ ظلم تا کجا ۔۔۔ کتنوں کے جی تو جلتے رہے امتحان میں

(۵) حزن تخلص گردھاری لعل نام، قوم کا کایستھ اور باشندہ شاہجہاں آباد کا تھا، مولف طبقات الشعرا نے اس کی ایک رباعی نقل کی ہے ؎

کہا زلف میں بل نہ گو شوارہ ٹوٹا ۔۔۔ کیا جانیے کس کا دل بیچارہ ٹوٹا

اسی رات میں بے طرح ستارا ٹوٹا دھڑکے ہے گا جی کہ اب خدا خیر کرے

(۶) بہاری لل، قوم کا کایستھ، باشندہ شاہجہاں آباد کا تھا، ایک مدت تک امروہہ میں مقیم رہا طبع رسا در فکر بجا رکھتا تھا،

آیا نظر ایک طفل فرنگی گورا سنگین نگاہ
پلٹن سی مژہ کی قلب دل کو توڑا بے جرم وگناہ

میں نے کہا ظالم کہیں صاحب سے تو ڈر اس پر میں
خرا کے لگا کہنے ہو تھوڑا اٹھوڑا دے کیا پرواہ

(۷) بیتاب تخلص، اور سنتو کھ رائے نام تھا، شاہجہاں آباد کا باشندہ، قوم کا کھتری، خلوت پسند تھا عزلت نشینی کی طرف کا رجحان تھا، ایک عرصہ تک چاندپور میں گوشہ نشین رہا، کم کہتا تھا لیکن بہت خوشگو تھا، ایک مختصر سا دیوان بھی ترتیب دیا تھا،

غافل نہیں اعتبار پل کا کیوں فکر عبث کرے ہے کل کا

(۸) مائل تخلص، شاہ محمدی نام، دہلی کے رہنے والے تھے، شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں مرشد آباد میں سکونت کی تھی، آج تمام اساتذہ میں شاعری کا سلسلہ سودا، درد اور مصحفی کی ذات سے قایم ہے کیونکہ غالب کے سوا دلی میں شاعری کے تمام سلسلے شاہ نصیر، ذوق اور مومن کی ذات سے قایم ہیں، مومن اور ذوق شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور مایل کو قایم سے تلمذ حاصل تھا۔

کیا کیا کہوں میں تجھ سے دل زار کی ہوس مشہور ہے جہان میں بیمار کی ہوس

(۹) ہادی تخلص، عبدالہادی نام، شاہجہاں آباد وطن تھا، گو سودا کے شاگرد تھے مگر مشورۂ سخن قایم ہی سے کیا کرتے تھے اس لئے ان کو بھی زمرۂ تلامذۂ قایم میں شمار کیا جاتا ہے،

صدقے ترے ہو کے مرگئے ہم کرنا تھا جو کچھ سو کر گئے ہم
خنداں خنداں جدہر گئے ہم گریاں گریاں ادہر گئے ہم

(۱۰) کمال تخلص، کمال الدین حسین نام، باشندہ کڑہ مانک پور شاگرد جرأت و قائم، لباس درویشی پہنکر سیر و سیاحت کرتے تھے دیوان و تذکرۂ شعرا نظر سے گزرا، (سخن شعرا) گارسان دی تاسی نے کمال کے تذکرہ "مجموعۂ انتخاب" کا ذکر کیا ہے اور لکھتا ہے کہ اس کا نام فقیر شاہ محمد یا شاہ کمال الدین حسین ہے، اس نے قایم کے تتبع میں قایم کے دس سال بعد ۱۸۰۳ء میں اپنا تذکرہ لکھا جابجا قایم کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ اکثر جگہ قایم کے تذکرہ سے مستفید ہوا ہے، چنانچہ اس نے بھی سعدی شیرازی کو پہلا شاعر قرار دیا ہے، کمال نے اپنے تذکرہ میں قایم کے دیوان سے بہت سا کلام نقل کیا ہے جس میں بیانیہ، ہجو اور دوسری قسم کی نظمیں داخل ہیں ہماری رائے میں یہ کمال وہی ہے جو کہ جرأت اور قایم کا شاگرد تھا،

بگڑے نہ کہیں عاشق و معشوق کی صحبت یوں بن کے نہ نکلا کرو بازار میں صاحب

گارسان دی تاسی نے قدرت اللہ شوق کو بھی قایم کا شاگرد بتایا ہے، چنانچہ لکھتا ہے "تذکرۂ ہندی جو طبقات الشعرا کے نام سے بھی موسوم ہے، اس کا مؤلف شوق بہت بڑا شاعر ہے، قایم چاندپوری کا شاگرد ہے، اس کے گھر میں اکثر مشاعرہ ہوتے تھے"

(رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۲۰ء)

جس طرح صوفیا کے نزدیک شریعت کے ظاہری و باطنی دو رخ ہوتے ہیں اسی طرح محققین کے نزدیک شاعری بھی خارجی اور داخلی دو حصوں میں منقسم ہے، خارجی شاعری میں اشیاء کے ظاہری خط و خال نمایاں کئے جاتے ہیں اس لئے اس سے صرف مناظر قدرت، وصف نگاری مداحی اور واقعہ نگاری میں کام لیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان تمام اصناف سخن میں شاعر صرف انہیں چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے جو محسوس طور پر نظر آتی ہیں خود اُس کو اپنے اندرونی جذبات کی آمیزش سے ان تمام چیزوں کو علیحدہ رکھنا پڑتا ہے لیکن غزل میں تمام تر شاعر کے اندرونی جذبات و کیفیات کی تشریح ہوتی ہے اس لئے اس میں صرف شاعری کے داخلی پہلو سے کام لیا جاتا ہے اور قدما کے کلام کا اصلی امتیازی وصف یہی ہے کہ انھوں نے شاعری کے ان دونوں حصوں کو بالکل الگ رکھا، یعنی قصاید وغیرہ میں خارجی حصہ سے کام لیا، اور غزل کو تمامتر جذبات و کیفیات سے لبریز کر دیا، ذیل میں ہم قایم کے منتخب کلام کا ایک حصہ درج کرتے ہیں جس سے اسکا اندازہ ہو سکیگا،

رکھیں اپنے تئیں پھر کس طرح دوست　　ہو تجھ سا شخص جب دشمن ہمارا

میں کن آنکھوں سے دیکھوں کہ سایہ ساتھ ہو تیرے　　مجھے چلنے دے آگے یا نک اسکو بیشتر لے جا

ادب آدمی آنکھوں میں خوب لگتا ہے　　گر یہ فرقہ خوباں ہو جسقدر گستاخ

جاتی ہے نسیم اس گلی کو　　اوٹھ سکے تو قافلہ ہے بہتر

سو جائے منہ لپیٹ کے جو یاد میں تیری　　سو جاگتے خفیف ہیں اس خواب کے حضور

آج آپ مرے حال پہ کرتے ہیں تاسف　　اشفاق، عنایات، کرم، مہر، تلطف

دی عاشق کی ترے حسرت دیدار سمجھو گا　　کھلی رہجائیں بعد از ذبح جب نخچیر کی آنکھیں

ہے گو کہ جذب مرا تار عنکبوت سی سست　　پہ شیر پھانسے ہیں اکثر اسی کمند سے میں

لبریز شوق میرا از بسکہ مو بمو ہے　　سمجھا نہیں یہ ابتک یہ میں ہوں کہ تو ہے

شبنم کے برگ گل پہ ڈھلنے پہ میں یہ سمجھا　　جو دیدہ در ہے اس کو شوق رخ نکو ہے

ہے رفوے صرف سی جامہ کا سری تار و پود　　بسکہ میں پھاڑا اُسے اور یار سلواتے رہے

قسمت کہ وہ چارہ گر ہے اپنا　　جو زخم سے تار رفو نہ سمجھے

شایان چمن نہیں وہ بلبل　　ہر گل کا جو رنگ و بو نہ سمجھے

غنچے نے کس کے بوسہ کو یہ لب کئے ہیں جمع　　گل کیوں بنا ہے باغ میں صورت کنار کی

کلام کا انتخاب یہ ہے:-

عہدہ سے اس صنم کے برآیا نہ جائے گا　　یہ ناز ہے تو ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ　　کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر　　مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا
لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قایم　　شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا
ناصح تو کہے ہے یوں کہ گویا　　ہے دل پہ کچھ اختیار میرا
اب تو نہ گل نہ گلستاں ہے یاد　　اس کے مکھڑے کی ہر زباں ہے یاد
بھلا اے ابر مژگاں اب تو بس کر　　ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر
کیوں کیا مجھکو تو صیاد گرفتار قفس　　نہ میں شایستہ بسمل نہ سزاوار قفس
جو سوز عشق کا چرچا وہاں نہیں قایم　　تو کیا میں جاؤں لگا دینے بہشت میں آتش
اے محنت آزمائے عاشق ہو　　تب خوش ہو کہ مر ہی جائے عاشق
آوے خزاں چمن کی طرف گر میں رو کروں　　غنچہ کرے گلوں کو صبا گر میں بو کروں
جور سپہر، دورئ یاراں، ورود غیر　　جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں
کسی بلا میں پھنسے، قید ہووے، جان جائے　　پر آدمی کو خدا تجھ پہ مبتلا نہ کرے
شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم　　پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی
کیا پوچھتے ہو موجب آزردگی یار　　دل دے چکے مدت ہوئی اب جاں طلبی ہے
مردن دشوار میں یہ حال بے تقصیر ہے　　حسرت دل سو طرف سے اسکی دامنگیر ہے
قتل کرنے سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل　　غرق آب شرم میں اب تک دم شمشیر ہے
نہ مرنے دیتے ہم قایم کو لیکن　　خداوندی سے کچھ چارا نہیں ہے
دامن گل تلک ہے کہاں دسترس مجھے　　تکلیف سیر باغ نہ کر اے ہوس مجھے
اپنے مذہب میں قرابت نہیں اجداد کی شرط　　جس سے نسبت ہے تجھے اس سے ہمیں خویشی ہے
گو کہیں یار بلایا ہے وہ اب آتا ہے　　پر اسے میں تو سمجھتا ہوں وہ کب آتا ہے
شب گریہ سے وابستہ مری دلشکنی تھی　　جو بوند تھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی
میں اس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا　　لے دل میں اپنے حسرت سرو و سمن گیا
شیریں تو ساتھ خسرو کے کر ذوق سے معاش　　پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہکن گیا
روؤں گا زیر سایۂ دیوار بیٹھکر　　جسدن تری گلی میں کسی داد بن گیا
ظالم تو مری سادہ دلی پر تو رحم کر　　روٹھا تھا آپ ہی تجھ سے میں اور آپ ہی من گیا

اب کے جو یہاں سے جائینگے ہم  پھر تجھکو نہ منہ دکھائیں گے ہم
ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم  جب گالیاں نت کی کھائیں گے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں  اس عہدے سے کب بر آئیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا  ٹک دور سے دیکھ جائین گے ہم
یوں چاہیے چاہ کا سر رشتہ  قایم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

---

خوش رہ اگر اے دل تو شاد نہیں  یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
تیرے دامن تلک ہی پہنچوں اور  خاک ہونے سے کچھ مراد نہیں
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات  ہنسکے کہنے لگا کہ یاد نہیں

---

نہ دلمیں آب ہے نہ نم رہا آنکھوں میں  کبھی تھے روئے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کیلئے  حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں
موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن  وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں
وہ محو ہوں کہ مثال حباب آئینہ  جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

---

جو کہ چہلیں تھیں سو تو ہائے گئیں یار کے ساتھ  سر ٹپکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ
ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے  بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ
میں ہوں دیوانہ سدا کا مجھے مت قید کرو  جی نکل جائیگا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

---

پاس میں تجھ غم کے میں اپنی بھی غمخواری نہ کی  جان دے گزرا پہ ظاہر دل کی بیماری نہ کی
دمبدم اس بخشش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ  دل دیا تجھکو تو کچھ میں نے گنہگاری نہ کی
بعد خط آنیکے اس سے تھا وفا کا احتمال  لیک واں تک عمر نے اپنے وفاداری نہ کی

---

زاہد در مسجد پہ خرابات کی تو نے  جی بھی ہی چاہے تھا کرامات کی تو نے
اے ہمرہو میں نالاں ہوں پر غیر نجانے  اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے
قایم رہ پر خوف ہے اور دور ہے منزل  کب پہنچے گا ظالم جو نہیں رات کی تو نے۔

---

دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے — شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے
ہمنشین ذکر یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے
گندمی رنگ جو ہے دنیا میں — میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

---

ہر طرف وہ نگاہ لڑتی ہے — کبھی ادھر بھی آن پڑتی ہے
کیا ہی بکھڑا ہے یہ کہ جس کے حضور — آئینہ کی قلعی ادھڑتی ہے
قایم آیا ہے اب وہ بن ٹھن کر — دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے

---

## مثنوی در شدت سرما

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
اندنوں چرخ پر نہیں ہے مہر — گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے — سبزہ وہ شال کی رضائی ہے
دیکھ گل پر صبا نہیب برد — بھرتی پھرتی ہے ہر طرف دم سرد
جس طرف اب نگاہ جاوے ہے — جو ہی جیوں بید تھرتھراوے ہے
بے حرارت ہیں سردی کے مارے — طرح یعقوب کے اب انگارے
ہے یہ آفت چراغ تک در پے — وکو باکھر باے شمع ہے
جاڑا لگنے کا بیچ تلک ہے حرف — بیٹی رہتی ہے ندوں ہی میں برف
شب جو رخشندگی پر برق آوے — ابر میں یوں ٹھٹھر کے رہ جاوے
کیا کروں اس کے حسن کی تقریر — جوں کسوٹی پہ سونے کی ہو لکیر
باد سے برگ کھڑکے ہیں اس بھانت — کے تو بلتے ہیں دانت سے دانت
آگ بھی ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہے — گودوں کے بیچ چھپتی پھرتی ہے
ویں ہیں برباد ٹھنڈ سے ایک دست — جو کوئی ہے سو آفتاب پرست
گر کسی مہروش کو دیکھے ہے — شیخ بھی اپنی آنکھیں سینکے ہے
دن کو کٹتی ہے دھوپ میں اوقات — کاٹے کمبل میں رات کاٹی ہے رات

قایم آخر ہے سردی کا مذکور  
شعر بھی گر خنک ہوں رکھ معذور

ہے گے جاتا نہیں ہے اب بولا  
ہو گئی ہے زبان بھی اولا

## حکایت

حکایت یہ ایک زن سے ہے یادگار  
کہ تھی سخت اوباش اور ہرزہ کار

کیا اون نے آ جا سے اپنے سوال  
کہ ہیں مرد پر چار عورت حلال

ہے کیا تہر چار عورت اور ایک مرد  
کہا اُن نے سن اس کو بھر آہ سرد

خدا اور پیغمبر جو تھا مرد تھا  
ہمارا وہاں کون ہمدرد تھا

## مخمس

شیخ تو نابود ہو وے یا ترا پندار نیست  
بتکدہ ویراں ہو یا ہوں برہمن یکبار نیست

کام کیا ہے مجھ کو گم ہوں اہلِ دینداری نیست  
کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

عاشقوں کے رونے کی کچھ اور ہی ہوتی ہے دُھن  
دیکھ ہم روتے ہیں لختِ دل تو جو چاہے تو چن

ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کہ آیا بات سن  
ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن

نسبت باریدگی دارد و لے خونبار نیست

سعیدی - بی اے (علیگ)  
ایم - آر - اے - ایس (لندن)



# رشتہ کی ضرورت

ایک مسلمان (سید) ایم اے ایل ایل بی جوڈیشنل افسر تنخواہ دار ۷۰۰ عمر ۳۰ سال ایک روشن خیال تعلیم یافتہ سلیقہ مند خوش مزاج خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے کسی قومیت یا ذات کی قید نہیں کیونکہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (اتم میں خدا کے یہاں عزت والا وہی ہے جو نیک سیرت ہے) فوٹو و خطوط ذیل کے پتہ سے

**پتہ :- مولوی سراج الدین احمد صاحب نمبر ۳ بیلی روڈ ڈاکخانہ کٹرا شہر الہ آباد**

# فلسفۂ مذہب

(بسلسلۂ ماسبق)

**مذہب اور تکوین**

"انسان کو عالم کی ابتدا یا انتہا کا کوئی علم نہیں ہے اور نہ ذہن ہی کی مدد سے کسی ایسے وقت کا تصور ہو سکتا ہے جس کے پہلے یا بعد کچھ نہ ہو۔ پھر بھی ابتدا اور انتہا ماننے کے لئے ہم مجبور ہیں۔ گویا ہمارا ذہن اس معاملے میں دونوں حالتوں کی نفی کرتا رہتا ہے۔ یعنی جسوقت ہم کسی حالت کی ابتدا یا انتہا قرار دیتے ہیں تو اس سے پہلے اور اس سے بعد کی حالتوں کا تصور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور جس وقت ہم اس سلسلے کو بغیر ابتدا اور بغیر انتہا کے یعنی لاتناہی قرار دیتے ہیں تو ذہن اس سلسلے کو ختم کرنے کا تقاضا کرتا ہے"

(کتاب "قیل و قال" مصنفہ مسٹر محمد فاروق۔ ایم۔ ایس۔ سی)

بالکل یہی مشکلات الٰہیات کو فلسفہ کی مدد سے سمجھنے میں لاحق ہوتی ہیں، اور آخر میں ایک فلسفی کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ زمانہ، مادہ، خلا، سماوات، خدا۔ یہ سب ناگزیر مگر ناقابل فہم مسلمات ہیں۔ اور الٰہیات کی طرح آفرینش عالم کا مسئلہ بھی فلسفی موشگافیوں میں الجھ کر رہجاتا ہے۔ تاوقتیکہ ہم ایک قول محکم یا الہام کی طرف رجوع نہ کریں۔

جب انسان نے اپنی ہستی اور کائنات کے نظام و ترتیب پر نظر ڈالی تو اس سوال کے ساتھ کہ اس عالم کا کون خالق ہے۔ یہ سوال لازمی طور سے پیدا ہوا کہ یہ عالم کیونکر پیدا ہوا۔ روزمرہ کے مشاہدات کے جو اثرات ہمارے دماغ میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی مدد سے ہم فوراً کسی چیز کے وجود کو اس سے پہلے ایک قطرہ یا بیج کی طرف منسوب کرتے ہیں جسکو ہم نے ملاحظہ کیا ہے اور ان پر توت نمو اور چند اصول ارتقار کے اثرات کو مانتے ہوے کائنات کی درجہ بدرجہ تبدیلیٔ ہیئت کو ایک مسلمہ واقعہ مان لیتے ہیں مگر جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تخم کہاں سے پیدا ہوا تو اگرچہ بظاہر تخم خود اس چیز سے پیدا ہوا جس کا وہ تخم کہلاتا ہے مگر مخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی کے سوا ہم نہیں کہہ سکتے کہ پہلے بیج پیدا ہوا ہے یا وہ چیز جس سے بیج نکلا ہے۔ اگرچہ انسانی عقل گوناگوں مخلوقات کے سلسلۂ نسب کو پیچھے ہٹاتے ہوے کم سے کم آخر میں ایک اولین مادہ یا ذرہ یا نقطہ یا مرکز یا تخم (جو کچھ بھی کہو) پر جا کر ٹھہر جاتا ہے اور اس کو اس تمام کثرت میں وحدت کا نتیجہ ملتا ہے مگر پھر بھی عقل اس مادہ یا بیج کا اصل پانے سے عاجز ہے اور اسی جگہ سے مذہبیت اور لامذہبیت کے راستے پھوٹتے ہیں۔ چنانچہ اس حیثیت سے مسئلہ تکوین مذہبی اعتقاد کا جزو عظیم ہے۔ اس عنوان میں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ سب سے پہلے انسان کی اولین فطرت نے اس کا کیا جواب دیا ہے پھر عقل سلیم یا عقل فلاسفہ کیا کہتی ہے۔ اور پھر اس مشکل کو الہام نے کیونکر حل کیا ہے۔

انسان کے ابتدائی ذہن نے یہ کبھی فرض نہیں کیا تھا کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے وہ بغیر کسی اصلی مادے کے بنا ہے محض عدم سے کسی چیز کا وجود میں آنا انسان کی ابتدائی عقل تسلیم کرنے سے عاری تھی زمین کی خلقت عام طور سے کسی مفروضہ جانور یا پرند کی طرف منسوب کی جاتی ہے کیونکہ جب تک انسان خود اپنی ہستی کا ابتدائی سررشتہ نہیں پاتا اس سے بالاتر خالق کے وجود کو سمجھنا تقریباً ناممکنات سے ہے - اس لئے زمین کے بنانے والے دابۃ الارض کے لئے ضرور تھا کہ اس میں خلاقی کی مافوق العادۃ صفات تصور کی جائے جو اسکے عظیم الشان کاموں کا آلہ تھیں - انسان کا ابتدائی خیال یہ تھا کہ شروع میں ایک کیڑا تھا - جو بڑھتے بڑھتے عظیم الجثہ انسانی ہیولی میں منتقل ہوگیا اور وہی ترقی کرتے کرتے آخر میں خالق اکبر کی صورت میں ظاہر ہوا - اس عظیم الشان انسانی ہیولی جسے یونان کی متھالوجی ڈیمیرج (DEMIURGE) کے نام سے معروف کرتی ہے اور وہ ادنی کیڑا جس نے اس صورت میں ترقی کی ہے - ان دونوں کے درمیانی درجے میں انسان کا وجود ہے کائنات کی خلقت پر جو مختلف خیالات عام طور سے وحشی اور قدیم اقوام میں پائے جاتے ہیں ان کا مجمل ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا - مزید تفصیل کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا مضمون

Cosmogony

امریکہ کی وحشی قوموں کا خیال ہے کہ پہلے ایک کالے کوے نے انڈا دیا اور اس انڈے سے انسان پیدا ہوا اور یہ عجیب وغریب قسم کا کوا جو ان کی زبان میں "ٹیل" یا "یلچ" کہلاتا ہے وہ ایک ڈبے سے چاند - سورج اور ستاروں کی گولیوں کو چرا لیجاتا ہے اور اس کے ذریعے سے دنیا کو روشن کرتا ہے - اس کوے کا ایک مخالف اور ضد بھی تصور کیا گیا ہے - جو رشتہ میں اس کا ماموں یا چچا لگتا ہے -

بعض دوسری امریکہ کی وحشی قوموں کا خیال ہے کہ زمین کا بنانے والا ایک بڑا خرگوش تھا جس کو وہ اپنی زبان میں "مسیکابو" کہتے ہیں - وہ چند دوسرے جانوروں کی سرداری میں ایک بحر ناپیدا کنار پر ایک تختہ کے اوپر پڑا ہوا ہے پھر یہ جانور اپنے ماتحت جانوروں کو سمندر میں غوطے لگانے کو بھیجتا ہے سمندر کے اندر سے وہ ریگ کا ایک ایک ذرہ لاتے ہیں اور اس سے وہ ایک جزیرہ بناتا ہے -

بعض دوسری وحشی قوموں میں یہ خیال ہے کہ دنیا میں سوائے پانی کے کچھ نہ تھا اور پانی کے اوپر آسمان تھا - پھر آسمان میں ایک سوراخ ہوگیا اور اس سوراخ سے ایک شخص سمندر میں گرا - اس کو سمندر کے ایک کچھوے نے اپنی پیٹھ پر لے لیا - جس پر پہلے سے کسی دریائی جانور نے کچھ مٹی رکھدی تھی - یہاں اس کو حمل ہوگیا - جس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور پھر اس سے دو توام لڑکے پیدا ہوئے ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے اپنی ماں کو قتل کردیا - پھر اس مقتولہ کی لاش سے ایک درخت پیدا ہوا - دوسرا لڑکا مارے خوف کے مغرب کی طرف بھاگ گیا اور اب وہ مرے ہوئے لوگوں پر حکمراں ہے - پہلے لڑکے نے جانور اور انسان پیدا کئے اور جب وہ سب کچھ کرچکا تو مشرق کی طرف غائب ہوگیا - جہاں وہ اپنی نانی کے شوہر کی حیثیت سے زندگی بسر کررہا ہے -

اہل میکسکو کا اعتقاد تھا کہ دنیا کی خلقت پانچ ادوار یا زمانوں میں ہوتی ہے یا پانچ آفتابوں کے قیام میں - پہلا آفتاب یا زمانہ دنیا کا تھا - دوسرا آگ کا تیسرا پانی کا چوتھا ہوا کا اور پانچواں بے نام ہے - ہر ایک جگ یا زمانہ ایک آفت ارضی کے ساتھ ختم ہوگیا - مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اہل میکسکو نے ان پانچ ادوار کے خلقت کے لئے کون سا نظریہ قائم کیا تھا - اہل پیرو (جنوبی امریکہ

میں مصریوں کی طرح آفتاب کے دیوتا کی پرستش ہوتی تھی۔ لیکن اس دیوتا کے اوپر اور بہت سے خالق تھے۔ انھیں میں سے ایک کا نام "دہری کوکا" تھا۔ جس کو اہل سیرو نے اپنی مناجات میں دنیا کا بنانے والا اور دنیا کا انتظام کرنے والا جانا ہے۔ اس دیوتا کا تعلق پانی سے تھا۔ ایک دوسرا خالق دیوتا "مانکو کاپک" کے نام سے مشہور تھا جس کے معنی عظیم الشان کے ہیں اور اس کی بہن جو اس کی زوجہ بھی ہے اس کا نام "ماما ایلو" تھا جس کے لفظی معنی "مادر بیضہ" ہے۔ یہ دونوں دیوتا بعد کو سورج اور چاند ہوگئے اور ان دونوں کی اولاد سے بادشاہان پیرو ہوئے ہیں۔ اہل پیرو میں خالق کے مخالف شیطان کے عقیدے کا بھی پتہ چلتا ہے اور ایک قصہ کے مطابق خالق دیوتا کا ایک شریر لڑکا تھا جو اپنے باپ کی بنائی ہوئی چیزوں کے بگاڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ باپ نے اس سے ناراض ہوکر اس کو سمندر میں پھینک دیا۔

جزائر اوقیانوس کے وحشی باشندوں میں پیدائش کے متعلق بہت دلچسپ فسانے ہیں۔ نیوزیلینڈ کی قوم "ماوری" کا عقیدہ ہے کہ آسمان و زمین پہلے ایک تھے۔ پھر ایک زمانے میں وہ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ یہی خیال تقریباً اہل چین و یونان و ہند و بابل کا تھا۔ "ماوری" کی اصطلاح میں آسمان کا نام رانگی اور زمین کا نام پاپا ہے اور ان دونوں کے اجتماع سے "تنگاؤ" پیدا ہوا جو سمندر کا دیوتا ہے اور پھر اس سے مچھلیاں اور رینگنے والے جانور پیدا ہوئے۔ بعض اوقیانوسی اقوام اسی کو آسمان کا دیوتا بھی کہتے ہیں۔ ان اقوام کا خیال ہے کہ آسمان بھی سمندر کی طرح ایک بحر محیط ہے اور بادل جو آسمان پر تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ آسمان کی کشتیاں ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دیوتا انڈے کے چھلکے کے اندر رہتا ہے اور جیوں جیوں وہ دنیا کو بڑھاتا جاتا ہے اوپر کا چھلکا پھیلتا جاتا ہے اور چھلکوں کی شکست وریز سے سمندر میں جزیرے بنتے ہیں۔ بعض قوموں کا خیال ہے کہ وہ ایک چڑیا کی طرح سمندر کی فضا پر منڈلایا کرتی ہے۔ اور اس کے انڈے سے جو اس نے سمندر پر دیا ہے زمین پیدا ہوئی اور اسی کے محراب دار حصے سے آسمان یا سورج بنے۔ یہی دیوتا تمام کائنات کا خالق ہے اور یہی طوفان وسیلاب و باراں کا خدا ہے۔ ان لوگوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ آخر اس دیوتا کو کس نے پیدا کیا اور آخر میں ایک فرضی شخص "پو" یعنی تاریکی پر تمام خلقت ختم ہوجاتی ہے۔

ہندوؤں میں تخلیق کے بارے میں جہاں رگوید کا یہ منتر ہے "تب نہ کچھ تھا نہ کیا تھا" منو جی نے اس کی تفسیر میں ایک بڑی لمبی چوڑی رام کہانی سنائی ہے (شائقین اسکی پوری صراحت کتاب الہند البیرونی میں پائینگے) مختصر یہ ہے کہ خدائے موجود نے اپنے امر سے پانی پیدا کیا۔ اور اس میں ایک تخم ڈالا جو بڑھکر ایک سنہرا انڈا ہوگیا۔ اور اسی انڈے سے وہ خود برہما کے اوتار میں پیدا ہوا۔ اور پھر برہما سے تمام عالم پیدا ہوا۔

قدیم مصریوں کا اعتقاد تھا کہ ذرات جس سے کائنات کی خلقت ہوئی ہے وہ ایک زمانۂ دراز تک تاریک طوفان میں بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ اس طوفان کو مصری "نون" یا "نو" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن یہ ذرات اس طوفانِ تار سے کیسے برآمد ہوئے۔ وہ کئی صورت سے بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض جگہ اس خالق دیوتا کا نام "نونون" ہے

جس نے ایک انڈا یا زمین بنائی اور اُس نے ہی آدمی کی خلقت بھی کی۔ بعض دوسرے مقامات پر "تاح" ایک صانع دیوتا اپنی کلہاڑی سے انڈے کا توڑنے والا خیال کیا جاتا تھا بعض اوقات "دوتھ" چاند دیوتا جو عقل اول خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے زمین کو اپنے کلام سے پیدا کیا "را" دیوتا کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ وہ دنیا کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس کی آخری عمر میں انسان نے اس کی کچھ حرمت نہ کی اور اسواسطے اس نے ناراض ہو کر چاہا کہ تمام انسانوں کا قتل عام کردے مگر بعد کو ایک آسمانی گائے پر سوار ہو کر دنیا سے چلا گیا اور وہاں جا کر ایک اور نئی دنیا اپنے رہنے کے لئے بنائی جو آسمان ہے۔

مجوسیوں کی کتاب "نبداہش" میں تخلیق کا ذکر یوں ہے کہ ابتدا میں نیکی وبدی کے دو مقابل ومخالف خدانے روحوں نے اپنی اپنی علٰحدہ مخلوق بنائی۔ کوئی تین ہزار برس تک دونوں کی مخلوق علٰحدہ علٰحدہ امن کے ساتھ پھیلتی گئی اس کے بعد نیک وبدروح میں جھگڑا ہوا اور چونکہ پہلے سے یہ قول ہو چکا تھا کہ نیک روح کی مخلوق نو ہزار برس سے زیادہ قائم نہ رہیگی۔ مگر نیک روح نے ایک منتر پڑھکر بری روح اور اسکی مخلوق میں گڑبڑ ڈالدی اور یہ گڑبڑ دوسرے تین ہزار برس تک رہی اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نیک روح نے پھر ملائکہ۔ چاند۔ سورج۔ آسمان کو بنایا۔ تین ہزار سال کے بعد بری روح اپنے شیاطین کی مدد سے جسکو اس نے پیدا کیا تھا پھر نیک روح کے مقابل آتی ہے اور ان شیاطین کی لڑائی نیک روح کی مخلوق سے شروع ہوتی ہے جو شمار میں چھ ہیں یعنی آسمان ۔پانی۔ زمین۔ نباتات۔ حیوانات۔ اور انسان۔ آخرالذکر کے اجداد اولین گائے اور کیامرث تھے۔

اہل کنعان ویونان میں بھی مصریوں کی طرح طوفان کے اندر سے ذرات کا نکلنا اور اُس کے بعد ایک انڈے کا پیدا ہونا اور پھر اس آسمان وزمین کا بننا وغیرہ اعتقادات تھے۔

پس انسان کے فطری قوائے ادراک نے تکوین کے بارے میں جو کچھ وہم وگمان کیا ہے اس سے دو نتیجے مستنبط ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ انسانی شعور (Instinct) اس کو دنیا کے ابتدا اور انتہا کے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مشاہدات کے اثر سے وہ اس کہنے کے قابل نہیں ہوتا کہ کائنات بالکل نیستی سے ظہور میں آئی۔ بلکہ وہ خیال کرتا ہے کہ ایک اصلی مادہ ہے جس سے تمام چیزیں ظہور میں آئی ہیں۔ اس مادہ کو غیر حادث اور ازلیت کا درجہ دینے کی طرف اسکا ذہن فوراً مائل ہوتا ہے مگر جب عقل سلیم اس پر غور کرتی ہے کہ مادے کے اُن بے شمار اشکال میں جو مختلف خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کا منبع ومخرج کیونکر ایک مادہ ہو سکتا ہے جب تک کوئی غیبی ہاتھ ان مادوں کو مختلف شکل وا وضاع وخصوصیت کے ساتھ پیدا نہ کرے تو انسانی عقول الٰہیات کی طرف مائل ہوتی ہے اور اس حیثیت سے مجوسیوں کا عقیدہ کہ ارواح نیک وبد مخلوقات کو ہستی سے ہستی کی طرف لائی ایک حد تک الہامی مذہب سے قریب آجاتا ہے۔

ارسطو کا خیال تھا کہ خدا نے بالذات ایک چیز پیدا کی۔ پھر اس نے ایک اور چیز پیدا کی اور اسطرح واسطہ در واسطہ تمام عالم وجود میں آیا۔ چنانچہ مخلوقات کی ترتیب یہ ہے کہ خدا نے سب سے پہلے عقل اول کو پیدا کیا۔ اس نے نفس کو۔ نفس نے

افلاک کو اور افلاک نے تمام عالم کو۔ اس صورت میں خدا نے اگرچہ تمام عالم کو پیدا کیا ہے لیکن وہ تمام عالم کا بلا واسطہ خالق نہیں ہے - ایک شے سے جب متعدد اشیاء صادر ہوتی ہیں تو اس تعداد کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ان کے آلات مختلف ہوتے ہیں۔ اور مواد کے اختلاف کی وجہ سے مختلف اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ خدا کی ذات میں ان تینوں میں سے کوئی طریقہ نہیں پایا جا سکتا مرکب القوے ہونا تو علانیہ باطل ہے۔ دوسرا احتمال اس لئے باطل ہے کہ ان آلات کا کوئی خالق ہوگا اور اگر کوئی اور خالق ہوگا تو خدا کا تعدد لازم آتا ہے۔ اور اگر خدا ہی انکا بھی خالق ہے تو اس کے بنانے میں اور آلات کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس صورت میں آلات در آلات کا غیر متناہی سلسلہ ماننا پڑے گا۔ اب صرف تیسرا احتمال رہجاتا ہے۔ اس میں بھی صرف یہی سوال پیدا ہوگا کہ ان مختلف مادوں کو کس نے پیدا کیا۔ خود خدا تو مختلف چیزوں کو پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر اور کسی نے پیدا کیا تو خدا کا تعدد لازم آتا ہے۔ اور یہ تینوں طریقے خدا کی نسبت ممکن نہیں۔ جالینوس کا خیال تھا کہ عدم محض سے کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔ عالم میں جو کچھ وجود میں آتا ہے۔ اس کا مادہ پہلے سے موجود تھا اس لئے مادہ قدیم ہے، خدا نے مادے کو پیدا نہیں کیا، بلکہ مادہ جو صورت اختیار کرتا ہے وہی خدا کا فعل ہے۔ اس کے جواب میں اسکندر فردوسی کا قول ہے کہ عالم محض عدم سے پیدا ہوا۔ ابن مسکویہ نے اس قول کو لیکر اس کی وضاحت کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ (دیکھو تاریخ الکلام علامہ شبلی)

اس قدر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ مادہ جب ایک صورت بدل کر دوسری صورت اختیار کرتا ہے تو پہلی صورت بالکل معدوم ہو جاتی ہے کیونکہ اگر معدوم نہ ہو تو صرف دو احتمال ہیں۔ یا یہ کہ وہ صورت منتقل ہو کر کسی اور جسم میں چلی جائے یا یہ کہ جہاں تھی وہیں موجود رہے۔ پہلی صورت بداہتہً غلط ہے۔ ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ مثلاً ہم جب موم کے ایک کرے کو مسطح شکل میں بدل دیتے ہیں تو کرویت کی شکل کسی دوسرے جسم میں منتقل نہیں ہو جاتی۔ دوسرا احتمال اس لئے باطل ہے کہ اگر دوسری صورت کے پیدا ہونے کے بعد پہلی صورت بھی قایم رہے تو اجتماع النقیضین لازم آئیگا۔ یعنی ایک چیز ایک ہی وقت میں گول بھی ہو۔ لانبی بھی ہو۔ اسلئے ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب نئی صورت پیدا ہوئی ہے تو پہلی صورت بالکل معدوم ہو جاتی ہے اور جب یہ ثابت ہوا کہ پہلی صورت بالکل معدوم ہو جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ نئی صورت عدم محض سے وجود میں آئی۔ اب صرف جوہر کی نسبت اس دعوے کا ثابت کرنا باقی رہجاتا ہے۔ اس کے لئے مقدمات ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہئے

(۱) مرکبات کی تحلیل، اخیر میں بسائط تک منتہی ہوتی ہے اور آخر میں صرف ایک مادہ بسیط رہجاتا ہے۔

(۲) یہ بدیہی امر ہے کہ مادہ کسی حالت میں صورت سے جدا نہیں ہو سکتا مادہ میں ہزار طرح کا انقلاب پیدا کیا جائے۔ لیکن کوئی نہ کوئی صورت باقی رہیگی اس لئے مادہ اور صورت متلازم ہیں۔

(۳) پہلے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صورت قدیم نہیں ہے بلکہ عدم محض سے وجود میں آئی ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ بھی ثابت ہوا کہ مادہ کسی حالت میں صورت سے جدا نہیں ہو سکتا تو ضرور ہے کہ مادہ بھی قدیم نہ ہو ورنہ صورت کا بھی قدیم ہونا لازم آئیگا

اور جب مادہ حادث ٹھہرا تو ضرور ہے کہ عدم محض سے وجود میں آیا ہو کیونکہ مادہ بسیط محض ہے اور اس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ تھی جس سے مادہ پیدا ہوا ہو۔

اب اگر ہم انفرادی طور سے کسی انسان کی خلقت کی تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ جمادات روزمرہ تحلیل ہوکر نباتات کی صورت میں منتقل ہوتے رہتے ہیں نباتات جانوروں کی غذا بنتی ہے۔ انسان نباتات اور حیوانات دونوں کو ہضم کرتا ہے جس سے اس کا خون بنتا ہے خون سے نطفہ کی پرورش اور پیدائش ہوتی ہے۔ نطفہ جب ماں کی رحم میں منتقل ہوتا ہے تو وہ ایک نہایت ادنی قسم کا کیڑا ہوتا ہے۔ گویا حیوانیت کی پہلی منزل میں ہوتا ہے مگر ماں کے پیٹ میں نو مہینے کے اندر اندر وہ تمام ارتقائی حالتیں گزرتی ہیں جو ظہور انسان سے پہلے غالباً لاکھوں صورتوں میں حیوانات پر گزری ہونگی" یہ ایک مختصر عالم کی کیفیت ہے جس پر ایک مختصر زمانے میں ارتقاء کے تمام دور ختم ہوجاتے ہیں اس سے آگے بڑھکر ہم جب اپنے گرد کے عالم کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم کو اس نظریہ کے قایم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ خلقت عالم بھی اسیطرح ایک ارتقائی قانون کی پابند ہوگی جس کو ایک حد تک علمائے اثریات وطبقات الارض کی تحقیق نے زیادہ واضح کردیا ہے۔ تو زمین و آسمان بقول جان اسٹوارٹ مل کے ایک بخار کے بادل سے شروع ہوئے۔ اس کا نام سائنس کی اصطلاح میں نیبولا ( Nebula ) ہے یہاں تک تو فلسفہ اور مذہب الہام متفق ہیں (ثم استوی الی السماء وہی دخان) جہاں سے ان دونوں کے اختلافات شروع ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ نیبولا کے عقیدے کو مان کر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیبولا یا بخار کا بادل کیونکر پیدا ہوا اور اس کا آغاز کیونکر ہوا مگر یہاں پر سائنس سوال تو پیدا کرتی ہے مگر اس کا جواب نہیں دیسکتی اور یہی وہ حد خیال ہے جہاں سے مذہب کی حکومت شروع ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ مانیں کہ مادہ کے اجزا بلا کسی علت کے خود بخود حرکت کرنے لگے اور حرکت سے تکاثف شروع ہوگیا تو ہم یہ فرض کرینگے کہ ان کی حرکت دائمی ہوگی مگر پھر بھی مادہ کی ابتدائی شکل سے موجودہ صورت میں آنے تک خواہ کیسا ہی بڑا اور طویل زمانہ صرف ہوا ہو۔ تاہم وہ زمانہ محدود ہوگا۔ اور اس زمانے سے پہلے مادہ کا اپنی سادہ حالت میں موجود رہنے کا زمانہ غیر متناہی ہوگا۔ پس اس قدر عرصہ تک مادہ کا بے حس وحرکت اور بغیر اجتماع کے موجود رہنا اور آخر میں ایک وقت پر تکوین عالم کا سلسلہ شروع کردینا ایسا فعل ہے جسکی کوئی علت مانی نہیں جاتی۔ اور سبب کا بغیر سبب کے موجود ہونا سمجھ میں نہیں آتا لہذا ہر چیز موجودہ عالم کے ایک محدود عرصہ کو ثابت کرتی ہے۔ کیونکہ اس کی جو شکل اب ہے وہ ایک وقت میں نہ تھی اور اس کی حالت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے اس کا آغاز کہیں نہ کہیں سے فرض کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے اصول موضوعہ کے طور پر اس دنیا کے آغاز میں بخار جیسی حالت کو فرض کرلیا ہے جس کے ذرات مع اپنے قوائے جاذبہ و دافعہ کے ایک دوسرے سے الگ ہوں گے اور یکساں طور پر منقسم ہوں گے۔ کیونکہ ذرات اگر یکساں پھیلے ہوئے ہوتے تو قوت جاذبہ ان اجزا کو ایک انبار کی صورت میں جو ہمیشہ کروی شکل میں رہے کسی عام مرکز ثقل کی طرف کھینچ لاتی اور قوت دافعہ اجزا کی باہمی رگڑ سے متحرک

ہو کر اور حرارت بنکر بغیر کوئی نتیجہ پیدا کئے ہوئے ایتھر میں سے گزر جاتی ہے پس اس وقت میں ضرور ہے کہ ان اجزا کی وضع اور اطوار باہم دگر مختلف ہوں گے اور وہ اجزا خاص خاص مرکزوں کی طرف کھنچے جا رہے ہوں گے اور ان ـــــ کی مقدار اور ان کی حرکتوں کی مقداریں بے انتہا تبدیلیاں ہوئی ہونگی اور اس طرح جمع کرنے والی قوتوں اور پھیلانے والی طاقتوں کی وساطت سے بار بار ذرات کی حیثیت کے بدلنے پر دنیا کے یہ انقلاب واقع ہوتے رہے ہونگے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو چیز یکساں تھی اس سے ترقی ہو کر وہ اجسام پیدا ہونے لگے جو حقیقت میں ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں اور جو چیز بے شکل تھی وہ شکل دار ہوگئی اور سادہ چیز مرکب در مرکب بنتی گئی۔ حتیٰ کہ یہ ترکیب جاندار مخلوق میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک پہونچ گئی۔ مگر اس تادیل سے بھی اگرچہ زمانہ کو اور زیادہ دراز ماننا پڑے گا۔ اس کا زمانہ بھی ضرور محدود ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہو کہ تغیرات چاہے کیسے طویل در طویل مانے جائیں اور خواہ اُن کی حرکت بھی بخارسے انجماد کی جانب ہو یا کسی اور طرز پر وہ سب ایک محدود زمانہ چاہتے ہیں اور قدیم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اگر مادہ قدیم ہے۔ تب یہی ضرور ہے کہ وہ پہلے بالکل سادہ شکل میں ہو۔ پس اگر مادہ کے سوا کوئی اور حالت موجود نہیں تو لازم آتا ہے کہ وہ اپنے سادگی کے لامحدود زمانے کو ختم کر کے ایک وقت پر بغیر کسی علت کے وہ شکلیں اختیار کرنے لگا ہے جس کا نتیجہ دنیا کی موجودہ حالت ہے غرض علمی مشاہدہ سے جس قدر ثبوت مہیا ہو سکتا ہے اس کا یہ نتیجہ یقینی ہے کہ محض مادہ واقعات عالم کو پیدا کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہو اور ایسا خیال کرنا معلول کو بغیر علت کے ماننا ہے جو قابل تسلیم نہیں۔

یہاں تک جن احتمالات کا ذکر ہوا ہے وہ ان لوگوں کے دماغ کا نتیجہ ہی جنھوں نے موجودات عالم کو دیکھا مگر انکی دلچسپیوں میں اس قدر محو ہوئے کہ اپنے خیال کو دنیا سے پرے تک نہ لیجا سکے اور اس لئے ابھی تک مذہبی عنصر یعنی نادیدہ ہستی کا اعتراف نہیں پایا گیا۔ لیکن آگے بڑھ کر جو خیالات پیدا کئے گئے ہیں وہ باختلاف مدارج اس غیر محسوس کا اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک وہ احتمال ہے جس میں کائنات کو ایک بالاتر ہستی سے وابستہ کیا ہے لیکن موجودات عالم کی عظمت بھی دل میں جاگزیں رہی ہے اور خدا اور مخلوق دونوں کو قدیم مان کر خدا کو اس مملکت پر قابض تسلیم کیا گیا ہے اور اس طرح پر کبھی خدا اور مادہ کبھی خدا اور شیطان اور کبھی خدا۔ مادہ اور روح تینوں کو غیر مخلوق اور قدیم ہونے کی عزت دی گئی ہے"

(پروفیسر محمود علی فی الکتاب دین و دانش)

بس خدا اور مخلوقات کے تعلق سمجھنے کے لئے موجودات عالم کی نسبت تین احتمال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) قدیم سے اسی طرح موجود ہوں گے۔

(۲) خود بخود پیدا ہوگئے ہوں گے۔

(۳) یا کسی خدا نے اُن کو پیدا کیا ہوگا

پہلے احتمال کی نسبت ہمیشہ سے موجود رہنے کے لئے غیر محدود زمانہ فرض کرنا پڑے گا۔ حالانکہ غیر محدود زمانۂ ماضی کا ن سمجھنا ممکن ہے۔ دوسرے احتمال کی نسبت یہ اعتراض ہوتا ہے کہ پیدا ہونے کے لئے کسی علت کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ قانو فاعلیت کا باطل ہونا لازم آئے گا اور تیسرے احتمال یعنی خدا کی قدرت سے پیدا ہونے کی نسبت تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں اول تو یہ کہ بغیر مادہ کے پیدا کرنے کی کوئی نظیر نہیں اور اگر مادے سے پیدا کیا ہے تو پھر اس مادے کی نسبت وہی تین احتمال ہوسکتے ہیں اور ہر احتمال پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس فضا میں یہ دنیا ہے وہ کہاں سے آئی۔ اگر فضا کو بھی خدا نے پیدا کیا تو مخلوقات سے پہلے فضا بھی ہوگی۔ حالانکہ ہم فضا کے نہ ہونے کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور تیسرے یہ کہ بنانے والا کہاں سے آیا۔ آیا وہ قدیم سے تھا یا خود بخود پیدا ہوا یا اس کو کسی اور خدا نے پیدا کیا اگرچہ یہ احتمالات ناقابل حل ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ موجودات عالم کو ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ ان کی حالت یوماً فیوماً اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے حتیٰ کہ ہماری عقل کی صحیح رفتار نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام زمین و آسمان ایک وقت پر اس صورت میں نہ تھے بلکہ جب سے موجود ہیں اپنی شکلوں کو بدلتے رہے ہیں۔ بس اگر یہ مخلوقات ہمیشہ سے مانی جائے تو سمجھ نہ سکنے کے علاوہ یہ بھی لازم آتا ہے کہ ان کے تغیرات بھی بغیر کسی علت کے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس احتمال پر بھی قانون علّیت کا باطل ہونا لازم آتا ہے اور اس وجہ سے اس احتمال پر جو اعتراض ہے وہ وزن میں دوسرے احتمال کے اعتراض سے مشابہت رکھتا ہے اور قانون دائمی کو توڑنے کے سبب اس احتمال کو بھی قابل ترک قرار دینا چاہیئے

اب ہم الہام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ خدا نے کائنات کو چھ دور میں پیدا کیا۔ قرآن میں لفظ "ایام" ادوار کے معنے میں آیا ہے۔ ایام سے ہمارا ذہن ایک محدود وقت کی طرف جاتا ہے جو طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک ہے لیکن کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آفتاب و ماہتاب و زمین بنانے کے وقت دن سے مراد یہی ہمارا دن ہوگا۔ ان ادوار کا کوئی متعین زمانہ نہیں کیا جا سکتا ممکن ہے ہزارہا سال ہو یا لاکھوں سال یا کروڑوں سال خود قرآن میں بعض جگہ دن کا شمار ہزار سال کے برابر کیا گیا ہے

(۱) وان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون

(۲) یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون۔

محققین کی رائے ہے کہ کسی زمانے میں جسکا شمار کروروں سال کی تعداد میں کیا جا سکتا ہے زمین ایک آتشین گولا تھی اور اغلب ہے کہ اس سے پہلے کرۂ آفتاب کا ایک جزر ہی ہو جس سے جدا ہو کر اس نے ایک علٰحدہ کرہ کی صورت اختیار کرلی

(اولم یر الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقاً ففتقنٰہما۔)

اور شدید حرارت وراثت میں پائی تھی حیوانات اور نباتات تو الگ رہے جمادات کی بھی یہ صورت نہ تھی جواب ہے تمام مادی اجزاء ایک شعلۂ جوالہ کی طرح تھے گویا نہایت لطیف ہوائی جسم رکھتے تھے اور اس لطیف مادے کی بھی صرف چند

قسمیں تھیں۔ رفتہ رفتہ حرارت کے زوال کے ساتھ بعض اجزا نے رقیق صورت اختیار کرلی اور بعض پھر بھی دخان اور ابخرات کی صورت میں اس کے گرد نہایت گرم ہوائی غلاف جمائے ہوئے تھے۔ یہ حالت کم سے کم کروڑوں سال میں پیدا ہوئی زیادہ عرصے تک ٹھنڈی ہونے کے بعد زمین پر انجماد شروع ہوا۔ جس طرح دودھ میں کھولنے کے بعد بالائی پیدا ہوجاتی ہے چونکہ اندرونی حصہ میں حرارت اور سیلان اب بھی زیادہ تھا۔ اس لئے اس میں ہر وقت ایک ہیجان اُٹھتا رہتا تھا جس سے بالائی طبقہ ہر وقت متزلزل رہتا اور جلد جلد صورت بدلتا رہتا تھا۔ کبھی کوئی حصہ زیادہ ابھر جاتا تو کوئی حصہ زیادہ دب جاتا کبھی کہیں کہیں سے کوئی حصہ پھٹ جاتا اور بڑے بڑے غار پیدا ہوجاتے جنمیں سے بھڑکتے ہوئے شعلے نکلتے رہتے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بلندی اور پستی نے زیادہ پائدار صورت اختیار کی اور جا بجا بہت اونچے پہاڑ اور انھیں کے مقابلے میں بڑی بڑی گھاٹیاں اور غار پیدا ہوگئے۔ اگرچہ زمین کا بالائی حصہ سخت ہوکر اب مثل پتھر کے تھا۔ پھر بھی حرارت کھولتے ہوئے پانی سے زیادہ تھی اور اس وجہ سے پانی کے اجزا اب بھی کثیف ابر کی صورت میں ہوائی غلاف کے ساتھ زمین کو محیط تھے لیکن کہیں بھی ایک قطرہ پانی کا نہ تھا (والقیٰ فی الارض من رواسی ان تمید بکم الخ)

جب زمین اور زیادہ ٹھنڈی ہوئی تو بارش کا سلسلہ شروع ہوا لیکن جلتے ہوئے توے پر جو پانی گرتا تھا۔ پھر بھاپ بنکر اڑ جاتا تھا۔ لاکھوں سال بارش ہونے کے باوجود دریا اور سمندر کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس حالت سے گزر کر زمین کی وہ صورت پیدا ہوئی جو ان تمام تغیرات کے ساتھ اب ہمارے سامنے موجود ہے۔ یعنی پانی نے زمین پر قیام اختیار کیا اور بعض بڑی بڑی گھاٹیوں اور غاروں کو بھر دیا جو سمندر ہوگئے متواتر بارش اور ہوا کے اثر سے پہاڑوں کے بعض جز گھس پس کر پانی کے ساتھ نشیب میں آکر تہ نشین ہوتے اور بعض جگہ غاروں کے بھر جانے سے سطح زمین کی صورت پیدا ہوگئی۔

زمین کی یہ آخری صورت بھی اگرچہ کروڑہا سال سے قایم ہے لیکن اس دوران میں بھی بڑی بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں جو ابتدائی حالت کے مقابلے میں پھر بھی ادنے خیال کیجاسکتی ہیں۔ بعض وہ مقامات جو پہلے سمندر تھے اب خشک ہوکر براعظموں میں تبدیل ہوگئے۔ جیسے افریقہ کا صحرائے اعظم یا ہندوستان کا شمالی حصہ جنمیں سے ہوکر دریائے گنگا اور دریائے انڈس اب بہتے ہیں۔ اس طرح بعض حصے جو اب سمندر ہیں پہلے خشک تھے، مثلاً بحر ہند کا وہ حصہ جو برہما اور اسٹریلیا کے درمیان میں ہے اور جنمیں گزشتہ زمانے کی ایک براعظم کی یادگار جزائر ملایا کی صورت میں اب موجود ہے یا یورپ میں وہ آبنائے جو فرانس اور برطانیہ کے درمیان واقع ہے۔ غرضکہ ابتدا میں زمین کو جلد جلد اور عظیم الشان حوادث کا سامنا ہوتا تھا رفتہ رفتہ سکون کی حالت پیدا ہوتی گئی اور حوادث کا اثر کم اور بہ دیر ہونے لگا۔

اس طرح گویا جمادات نے سرد و گرم زمانہ کا مقابلہ کرکے روز بروز اپنی ایک زیادہ دیرپا صورت اختیار کرنا شروع کی نباتات اور حیوانات کا دور اس کے بہت بعد شروع ہوا لیکن تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قسم کے درخت اور جانور پہلے

اس دنیا میں پائے جاتے تھے اب وہ بالکل مفقود ہیں اور ان کی جگہ دوسری قسم کے درختوں اور جانوروں نے لیلی ہے مختلف زمانے کے اجسام نامیہ یعنی نباتات اور حیوانات کو جب ہم سلسلہ وار رکھ کر مقابلہ کرتے ہیں تو چند باتیں آئیں پاتے ہیں۔

اول یہ کہ ہر زمانے کی مخلوق اپنے سے پہلے زمانے کی مخلوق سے ملتی جلتی ہے اور جو تبدیلیاں ان کی صورت اور شکل میں ہوئی ہیں وہ بہت آہستہ آہستہ ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نئی صورتیں ایسی پیدا ہوتی گئی ہیں جو حوادثِ زمانہ کا مقابلہ زیادہ قوت کیساتھ کرسکتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ زمین کے مختلف حصوں میں پھیل جانے کی وجہ سے نباتات اور حیوانات نے اپنی ضرورت کے مطابق چند نسلوں میں اپنی صورت اور شکل میں تبدیلیاں پیدا کرلی ہیں۔ اس طرح گویا تمام اجسام نامیہ جو اس وقت تک دنیا میں پائے جاتے ہیں ایک ہی اصل کی شاخ ہیں جو لاکھوں صدیوں کے تغیرات کے بعد اب اپنی موجودہ صورت پر بظاہر قائم ہیں۔ لیکن در اصل قانون قدرت یا اصول ارتقاء اب بھی ان کے اندر کام کر رہا ہے اور ماحول کی مناسبت سے اب بھی ان میں ذہی خفیف تبدیلیاں برابر جاری ہیں۔

بنی نوع انسان کے وجود کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ کم وبیش ایک لاکھ سال سے اس دنیا میں موجود ہے لیکن دس ہزار سال پہلے کے جن انسانوں کی لاشیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کی ساخت جسمانی۔ ان کی ہڈیاں اور خاصکر ان کی کھوپریاں موجودہ زمانے کے انسانوں سے کسی قدر مختلف ہیں انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو ان کے جسم بمقابلہ ہمارے زیادہ مضبوط تھے، مگر ان کی دماغی حالت اور قوائے ذہنی کمزور رکھتے یہی حالت دوسرے حیوانات کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ زمانہ سابق کے بعض جانور نہایت عظیم الجثہ اور جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے عجیب الخلقت تھے۔ مگر دماغ بہت چھوٹا اور کمزور رکھتے تھے۔ اور اس وجہ سے وہ اپنی نوع کو قائم نہ رکھ سکے۔ بالآخر قدرت نے ان کو رفتہ رفتہ دوسرے انواع میں تبدیل کردیا۔ جن کے قوائے ذہنی کو بمقابلہ اعضائے جسمانی کے زیادہ ترقی ہوتی گئی اور وہ حوادث عالم کا زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل ہوتے گئے۔

پچاس ہزار سال یا ایک لاکھ سال قبل کے جو انسان تھے ان میں اور موجودہ زمانے کے بعض بندروں کی قسموں میں بہ لحاظ جسمانی اور دماغی ساخت کے بہت تھوڑا فرق معلوم ہوتا ہے اس وجہ سے اکثر یہ قیاس کیا گیا ہے اور یہ قیاس قرین عقل بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سلسلۂ ارتقاء میں سے گزرتے ہوئے انسانیت سے پہلے ایک دور میمونیت کا بھی حضرت انسان پر گزرا ہے یا بہ الفاظ دیگر ایک لاکھ سال یا اس سے پہلے کے بندروں میں جو تبدیلیاں بہ تقاضائے ارتقاء ہوئی ہیں ان کا مجموعی نتیجہ انسان کا وجود ہے۔

یہیں پہونچکر ایک مذہبی آدمی کا پیمانۂ صبر لبریز ہوجاتا ہے اور وہ بے اختیار سوال کر بیٹھتا ہے کہ کیوں صاحب حضرت آدم کو خدا نے پیدا نہیں کیا۔ میرے پاس صرف اس کا ایک جواب ہے۔ یعنی اس تمام سلسلۂ تغیرات میں مجھے

تو سوائے ایک واحد موثر کل حکیم و دانا ہستی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر اگر حضرت آدم کو خدا نے پیدا نہیں کیا تو کیا میں نے یا آپ نے پیدا کیا۔ لیکن میں اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر حضرت آدم یا بہ الفاظ دیگر حضرت انسان کی خلقت بجائے اتفاقی کے ارتقائی تسلیم کی جائے تو خدا کی خدائی پر کیا حرف آتا ہے۔ انسان کی پیدائش کا قصہ جیسا کہ کتب مذہبی میں مذکور ہے میں عمداً اس وقت اس کی تفصیلی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اصول ارتقا کی وسعت اور اس قانون کی ہمہ گیری کے متعلق چند الفاظ لکھ کر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ انسان نے کب اور کس وقت اپنا طریق حیوانیت چھوڑ کر جامۂ انسانیت اختیار کیا اور نیابت الٰہیہ کا استحقاق پیدا کیا تو میں کہونگا کہ جسوقت سے اس نے اپنے گرد وپیش کے چیزوں کے نام رکھنے شروع کئے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے (وعلم آدم الاسماء کلہا یعنی آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے اور اسی نطق کے ذریعہ سے جب وہ ان رموز قدرت کو فاش کرنے پر آمادہ ہوا جس کا مشاہدہ مختلف صورت و اشکال میں سے گزرتے ہوئے اُس نے کیا تھا تو بہشت کی غیر ذمہ دارانہ زندگی اس سے چھین لی گئی۔

اب اگر ہم کارخانۂ قدرت پر ایک نظر وسیع ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ نہ صرف خاکدان عنصری میں جسکو زمین کہتے ہیں بلکہ عالم خلق کے ہر ہر جز پر چھوٹے چھوٹے ذروں سے لیکر عظیم الشان ثوابت تک جس کی روشنی ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سکنڈ چلنے کے باوجود ہم تک برسوں بلکہ صدیوں اور کبھی ہزاروں برس میں پہونچتی ہے اصول ارتقا کی حکمرانی ہے اور ہر آن اور ہر لحظہ کے تغیرات اسی ایک قانون کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ نبی نوع انسان کے حالات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ اس کا تعلق سیاسیات، تمدن، معاشرت، اخلاق، مذہب غرضکہ کسی شے سے ہو ایک نہ ایک تغیر ہر لحظہ رونما ہوتا رہتا ہے اور ہر تغیر کا میلان یہ ہوتا ہے کہ پچھلی صورت کو چھوڑ کر نئی اور بہتر اور زیادہ پائیدار حالت اختیار کی جائے۔ حتیٰ کہ انسانی ذہن اور انسانی تخیلات میں اصول ارتقا کے مطابق ترقی جاری ہے۔ انسان کو ایک مافوق الانسان نوع میں تبدیل ہونے کیلئے صرف دس بیس ہزار سال کا عرصہ چاہئے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے بڑھکر کیا ہونے والا ہے۔ حضرت مولینا جلال الدین رومی نے اس عمل ارتقا کو بیان کرتے ہوئے انسان کی انتہائی ترقی کی طرف نہایت دلکش اشارہ کیا ہے۔"

| | |
|---|---|
| از جمادی مردم و نامی شدم | وز نما مردم بہ حیواں بر زدم |
| مردم از حیوانی و مردم شدم | پس چہ ترسم کہ ز مردن کم شدم |
| جملۂ دیگر بمیرم از بشر | تا بر آرم با ملائک پر و سر |
| بار دیگر از فلک قرباں شوم | آنچہ اندر وہم نا ید آں شوم |
| پس عدم گردم عدم چوں از | گویدم انا الیہ راجعون |

(منقول از کتاب قیل وقال۔ مسٹر محمد فاروق)

جو بات میں خود کہنا چاہتا تھا اس کو ہمارے قابل دوست نے اس خوبی سے اپنی کتاب میں ادا کیا ہے کہ میں نے ان کی پوری بحث انہیں کی پاکیزہ عبارت میں نقل کرنا کافی سمجھا اور اس طرح ارتقاء کی تھیوری کو مذہب کے رنگ میں دکھانے سے جو مجھکو پس وپیش تھا۔ اس سے میں اب بخوبی عہدہ برآ ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کی خلقت اتفاقی بانی جانے یا ارتقائی۔ اس کی وجہ سے مذہب پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ آخری صورت کا ماننا عقل کے لئے زیادہ آسان وبہتر ہے بہ نسبت پہلی صورت کے جبکہ ہماری علمی تحقیقات خود اس کی موئد ہے اور اس طرح مذہب اور سائنس کا اتحاد بخوبی ہو سکتا ہے تو صرف یہ سوال باقی رہتا ہے کہ الہام نے کیوں ان رموز کو واضح نہیں کیا۔ اور جب وہ ان باتوں سے خاموش ہے تو اس کاوش کی ضرورت ہی کیا۔ مذہب انسان سے صرف اس قدر چاہتا ہے کہ وہ یہ تسلیم کرے کہ انسان اور عالم کا وجود خدا کی قدرت کا نتیجہ ہے مگر یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کی قدرت کے مختلف جلووں پر اپنی غائر نظر ڈالکر اس خالق یکتا کی عجیب وبے مثل دانائی کے زیادہ مقر ہوں اور اس حیثیت سے یہ جستجو ہمکو مذہب کی طرف سے زیادہ مطمئن کر دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آدم کا ہبوط پانچ ہزار سال سے زیادہ نہیں ہوا جیسا بائبل کی روایت ہے (اور باوجودیکہ قرآن اس سے خاموش ہے مگر ہمارے یہود پرست علماء کی راہ ہدایت وہی بائیبل کی روایت ہے) تو اس کی تائید میں ہمکو طبقات الارض اور جغرافیۂ عالم کے ان بدیہیات سے انکار کرنا پڑیگا جو ہمارے مذہب کو عقلاء کے نزدیک بازیچۂ اطفال بنادیں گے۔ یا پھر بائیبل کے آدم کو بنی اسرائیل کا قومی آدم ماننا پڑے گا۔ اس واسطے کہ ہزار یا ہزار سال میں موجودہ سمندروں اور آبناؤں اور خاکناؤں کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ زمین کو کوئی سمندر جدا نہ کرتا تھا۔ پس اگر حضرت آدم کی اولاد دنیا میں ایک مرکز سے پھیلی تو یقیناً پانچ ہزار یا چار ہزار سال قبل اس کو زمینوں کے درمیان ناقابل عبور سمندر ملے ہوں گے۔ ایسی صورت میں آدم کی اولاد اپنے ابتدائی زمانہ میں جبکہ اس نے عبور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ پایا ہوگا۔ کیونکر جزائر اور ماورائے بحر خطوں میں پہونچی ہوگی۔ اس لئے اگر تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں تو ان کا زمانہ بہت ہی دور کا ماننا پڑے گا رہا یہ کہ آب وہوا اور ماحول کا اثر انسانی قوائے جسمانی وذہنی پر ہوا ہے یا نہیں۔ وہ ایک صریحی وبدیہی بات ہے جو افریقہ کے ایک حبشی اور ایک مغولی ـــــــــــ کے موازنہ سے فوراً مشاہدہ میں آسکتی ہے اور یہ تغیرات اسی اصول ارتقا اور ماحولی اثرات کے ماتحت ہیں جہاں پر ہم ڈارون سے اختلاف کر سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ڈارون کو ارتقاء تکوین کے پیچھے خدائی ہاتھ نظر نہیں آتا اور ہم بلا تردید وبلا خوف ملامت سائنس ان مشاہدات قدرت کے پیچھے اس صانع بے ہمتا کے وجود کا اقرار کر سکتے ہیں۔

سید مقبول احمد

# من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۱۰)

اب البتہ مجھکو معلوم ہو رہا ہے کہ زندگی کس کو کہتے ہیں جینے کی لذت اتنی عمر کھو کر مجھکو ملی ہے۔ اب میرے دل میں سوا اس کے کوئی تمنا نہیں ہے کہ "ہمچو زلیخا بہ شبابم رساں" لیکن یہ محض پیرانہ سری کی ایک ہوس ہے جو بالکل لغو ہے۔ ہماری زندگی سرتاسر عیش ہے اور اب ہم کو کسی موہوم تمنا سے اپنا دل نہ دکھانا چاہئے"۔ عائشہ اس وقت جذبات میں سرشار تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ساون کا موسم تھا۔ ابوالخیر اور عائشہ دوش بدوش جوہی اور بیلے کی کیاریوں میں دنیا اور دنیا کے نشیب و فراز سے بے خبر ٹہل رہے تھے۔ عائشہ اپنی رگ رگ میں ایک مستی محسوس کر رہی تھی۔ ابوالخیر بھی اپنے اندر کچھ تو موسم کے اثر سے لیکن زیادہ تر عائشہ کے قرب سے ایک خاص سرور پا رہا تھا۔ عائشہ کی زبان سے یہ الفاظ سنکر اس نے اپنی آغوش میں کھینچ لیا اور مخمور آنکھوں سے اُسکو دیکھنے لگا۔ عائشہ کی رگیں پھڑکنے لگیں وہ ابوالخیر سے لپٹ گئی اور کہنے لگی "ہاں تم اسی طرح اپنی خواب آلودہ نگاہوں سے مجھکو دیکھتے رہو یہ نگاہیں میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں"۔ ابوالخیر نے اس کے میگوں ہونٹوں کا بوسہ لیا۔ عائشہ مدہوش ہو گئی اور کہنے لگی تمہارے بوسے میرے لئے اتنے جاں بخش کیوں ہوتے ہیں؟"۔ ابوالخیر نے دوسرا بوسہ لیا لیکن پھر نہ جانے کس خیال میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد عائشہ نے پوچھا "کیوں چپ کیوں ہو گئے؟"

"کچھ نہیں" ابوالخیر نے کہا "میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ کاش تمہارے یہاں موجود ہونیکا علم مجھے اور پہلے ہو جاتا تو آج مجھ سے وہ حماقت سرزد نہ ہوتی جس کے خیال سے میں کبھی کبھی بدمزہ ہو جاتا ہوں اور کف افسوس ملکر رہجاتا ہوں"۔ عائشہ چونک پڑی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے کہا "ابوالخیر تم نے اسوقت اس کا ذکر کر کے میری مسرت کیوں چھین لی۔ دیکھو میرا دل پھر دھڑکنے لگا۔ تم کیسے بیدرد ہو میں اپنی محرومیوں کو بھول گئی تھی۔ تم نے یاد دلا دیا۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم میرے نہیں ہو۔ اور میری زندگی ہمیشہ تمہارے ساتھ نہیں گزر سکتی لیکن کم از کم اسوقت تو مجھے مسرور رہنے دیتے۔ اُف دنیا واقعی دار المحن ہے۔ کیا دوزخ ہے۔ سوا تلخیوں اور اندوہناکیوں کے انسانکے مقدر میں کچھ نہیں ہے یہاں اگر ایک لمحہ سرور و انبساط کا ہے تو ایک پوری عمر رنج و الم کی ہے۔ ہاں ہاں تم دوسرے کے ہو۔ تم چند دنیوی رسمیں ادا کر کے بدر اسکے ہو گئے ہو جاؤ مجھے چھوڑ دو۔ میں پھر اپنی بدبختی سے مانوس ہو جاؤنگی۔ جب انسان کی قسمت میں آسودگی اور طمانیت نہیں ہے تو

اس کے دل میں جذبات اور تمناؤں کا ایسا ہنگامہ کیوں برپا کر دیا جاتا ہے؟ جب اس کی تشنگی بجھائی نہیں جاسکتی تو اس کو تشنگی دی کیوں جاتی ہے؟ مجھ کو دیکھو۔ میں تم کو چاہتی ہوں۔ تمہاری آرزو میں دن رات تڑپتی ہوں اور تم اتنی مدت کے بعد ملے بھی تو اب ہر وقت اس اندیشہ میں دل دھڑکا کرتا ہے کہ ایک نہ ایک دن تم مجھ سے قطع نظر کر لوگے۔" عائشہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔

ابوالخیر نے دیکھا کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تو اس نے جلدی سے عائشہ کو سینہ سے لگا کر کہا "بیکار بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ تم اگر مجھکو چاہتی ہو تو میں بھی تم کو چاہتا ہوں اس کا میں عملی ثبوت بھی دے رہا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ کوئی نہ کوئی صورت نکالی جائیگی کہ اب ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ اس لئے کہ اب ہماری محبت اس حد تک پہنچ گئی ہے جہاں سے بازگشت ناممکن ہے۔ تم خواہ مخواہ دل نہ دکھاؤ۔" اس کے بعد ابوالخیر نے کچھ ایسا جادو کیا کہ عائشہ پھر ماضی و مستقبل سے بے خبر ہوگئی۔ ابوالخیر کو اب کسی کے کہنے سننے کی پروا نہ تھی۔ وہ عائشہ کی رفاقت کو اپنے حق میں خداداد نعمت سمجھتا تھا وہ علانیہ اور سب کے جانتے ہوئے عائشہ سے ملنے لگا تھا اور اکثر دن کا دن اور رات کی رات "نصیر کوٹ" میں رہجاتا تھا۔ بدورا سے اس کو کوئی تعلق باقی نہ تھا۔ اگر کبھی رات کو نشہ میں چور آتا بھی تو یا تو بدورا سے کسی نہ کسی بات پر لڑنے لگتا یا پھر خاموش الگ اپنے بستر پر پڑ کر سو رہتا۔

بدورا کو بھی ابوالخیر سے کوئی انس باقی نہ تھا۔ وہ خون کے آنسو ضرور رو رہی تھی مگر ابوالخیر کے لئے نہیں بلکہ اپنی اور اپنے باپ کی غلطی پر۔ اب روز بروز اس کے سر میں احمد کا جنون جڑ پکڑ رہا تھا۔ بیٹی کی بدقسمتی پر قربان علی اتنا رو چکے تھے کہ اب ان کو رونیکی بھی تاب نہ تھی۔ ایک تو بڑھاپا۔ اسپر یہ صدمہ۔ بیچارے کی تندرستی دھیرے دھیرے جواب دے رہی تھی وہ سوچتے تھے اور ان کی عقل کام نہ کرتی تھی۔ کئی بار انھوں نے سوچا کہ ابوالخیر کو مجبور کر کے بدورا کو طلاق دلوا دیں لیکن اس معاملہ میں ان کی نہیں چل سکتی اور ابوالخیر کی ذات سے یہ امید نہ تھی کہ وہ آسانی سے طلاق دینے پر خود راضی ہو جائیگا۔ اس لئے قربان علی چپ تھے اور ضبط و تحمل کے ساتھ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

## ۱۱

جس دن ابوالخیر اور عائشہ کی "ہم آویزی" کا یہ عالم تھا کہ ستارے بھی دیکھکر اپنی آنکھیں پھیر لیں اس کے دو تین روز بعد شام کو بدورا اپنے کمرہ میں پچھم کے جھروکے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دور تک کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ دور وز سے جھڑی لگی ہوئی تھی اور دم بھر کے لئے بارش کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ تاحد نظر پانی ہی پانی تھا۔ بدورا اس وقت ایک ایسی فوق الادراک قوت کو ششجہت پر مسلط دیکھ رہی تھی جسکے ہوتے ہوئے مجبور محض مٹی کے پتلے کے مساعی جمیلہ کا رائگاں ہو جانا کوئی غیر معمولی یا خلاف توقع بات نہیں۔ جس قدرت کاملہ کے اختیار میں یہ ہو کہ دیکھتے دیکھتے ریگستان کو سمندر اور پھر بات کی بات میں سمندر کو ریگستان بنا دے۔ جو ہستی پربت کو رائی اور رائی کو پربت کر سکتی ہو۔ جس نے سامنے ایسا مہیب اور دہشت ناک جنگل

کھڑا کر دیا ہو۔ اس کے سامنے انسان کی حقیقت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ بدورا سوچ رہی تھی کہ انسان بھی کیسا مجبور مطلق ہے ہلاکت و بربادی کے اسباب ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر اس کے لئے خطرات ہیں۔ ابھی جس مکان میں وہ ہے جھپٹ بیٹھ سکتی ہے۔ کسی کونے سے ایک سانپ نکل کر اس کو ڈس سکتا ہے۔ ابھی ہوا کے ایک جھونکے میں اس کو زکام ہو سکتا ہے جو بڑھ کر "بڑی سردی" ہو سکتا ہے اور اس کا کام تمام کر سکتا ہے۔ ابھی وہ ٹھوکر کھا کر زمین پر اس طرح گر سکتی ہے کہ اس کے دماغ کو کوئی مہلک صدمہ پہنچ جائے اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ جب انسان کی زندگی ایسی بے اعتبار ہے تو زندگی کا لالچ کیوں ہو؟ — جینے پر لوگ اس طرح جان کیوں دیتے ہیں؟ — بدورا کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ احمد کی باتیں اس وقت بے طرح اس کو یاد آ رہی تھیں۔ وہی باتیں جن پر کسی زمانہ میں وہ ہنسا کرتی تھی اور جن کو احمد کے منہ پر "توہمات" یا "خرافات" کہہ دیا کرتی تھی۔

جنگل بھانت بھانت کی بے شمار آوازوں سے گونج رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بلاؤں نے یہاں اپنی جولانگاہ بنا رکھی ہے۔ بدورا پر ایک ہیبت طاری تھی۔ اتنے میں جنگل کے اندر سے "پوت! پوت! پوت!" کی دلدوز صدا اٹھی اور ہوا کی موجوں میں منتشر ہو کر رہ گئی۔ بدورا کے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اس آواز سے مانوس تھی۔ یہ مہوک کی آواز تھی۔ جاہل اور اوہام پرست دہقانیوں میں یہ قصہ مشہور تھا کہ مہوک کسی زمانہ میں ایک بار ہماری آپ کی طرح انسان تھا۔ میاں بیوی افلاس و فلاکت میں صبر و قناعت سے بسر کر رہے تھے۔ شوہر مہوے جمع کر کے لایا بیوی نے بیٹے سے اس کو سکھانے کے لئے کہدیا اور خود کسی کام سے باہر چلی گئی۔ شام کو جب واپس آئی تو دیکھا کہ مہوہ وزن اور مقدار میں اتنا نہیں بلکہ آدھا ہو کر رہ گیا ہے۔ سمجھی کہ یا تو بیٹا بیٹھا کھا تا رہا ہے یا کسی پڑوسی کو دیدیا ہے۔ یہ سمجھ کر بیٹے کو خوب مارا۔ دوسرے دن میاں بیوی دونوں مہوے جمع کر کے لائے اور بیٹے کو سکھانے کے لئے مامور کر کے اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے۔ شام کو پھر مہوہ سوکھ کر آدھا ہو گیا۔ ماں نے لڑکے کو پھر مارنا شروع کر دیا۔ تیسرے دن پھر یہی اتفاق ہوا اور اب کی بیٹے پر اتنی مار پڑی کہ وہ مر گیا۔ اب ماں خود مہوے سکھانے بیٹھی۔ مہوہ حسب دستور سوکھ کر آدھا ہو گیا۔ ماں پر حقیقت ظاہر ہو گئی مہوے کی خاصیت یہی ہے۔ بیٹے کو مار ڈالنے کا اب ایسا رنج ہوا کہ وہ چڑیا بنکر "پوت پوت" کہتی ہوئی اڑ گئی۔ باپ بھی اس کے پیچھے پیچھے اڑ گیا کہا جاتا ہے کہ جب مادہ "پوت! پوت!" کا نعرہ مارتی ہے تو نر "چپ! چپ!" کہکر اس کو صبر دلاتا ہے۔

بدورا بچپن سے اس قسم کی روایتیں سنا کرتی تھی مگر ان "اساطیر الاولین" میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ برخلاف اسکے احمد ان روایتوں کو خاص وقعت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ فطرتاً اس میں وہ مادہ زیادہ تھا جس کو "جاہلیت" یا "بیگانیت" کہہ سکتے ہیں۔ خدا پرستی سے زیادہ "عناصر پرستی" اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی تھی۔ بعض اسکو جاہل۔ بعض شاعر اور بعض کافر یا دہریہ کہتے تھے۔ بدورا کو یاد آ گیا کہ اب سے تقریباً آٹھ برس پہلے جبکہ ایک روز وہ احمد کے ہمراہ مکان کے پس پشت باغ میں ٹہل رہی تھی یہی آواز آئی تھی اور احمد نے کہا تھا۔ "بدورا دیکھو صرف انسان نہیں

بلکہ ہر چیز کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ غلطیاں کرے اور پھر پچھتائے لیکن غلطی کرنا کسی کے اختیار کی بات نہیں ہے۔ غلطی کرائی جاتی ہے۔ پچھتانا اور اپنے کئے پر سر پیٹنا البتہ اپنا کام ہے۔ بدورا تم سمجھوگی کہ میں کفر بک رہا ہوں۔ لیکن یقین مانو جب کبھی قرآن کے اس ٹکڑے پر پہنچتا ہوں (اللہ یستھزء بھم و یمدھم فی طغیانھم یعمھون ٥) تو میرا دل بیساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ صرف ان سفیہوں کی سزا نہیں ہے جو ایک طرف تو "امنا" اور دوسری طرف انما نحن مستھزءون کہتے ہیں۔ بلکہ ساری مخلوقات کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ گنہگار ہیں یا بیگناہ اور اس "طغیان" میں پھینکے جانے کے مستحق ہیں یا نہیں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سر تا سر "مالک قضا و قدر" کا ایک دل دکھانیوالا استہزاء ہے۔" بدورا نے احمد کی باتوں کا اس دن بڑا مضحکہ اڑایا تھا اور اس کو ڈانٹا بھی تھا کہ توبہ کرو توبہ۔ کیسے فاسد خیالات کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہو! یہ کفر نہیں تو اور کیا ہے؟" احمد چپ رہگیا تھا۔ لیکن آج خود بدورا کے دل میں انھیں فاسد خیالات کا ہجوم تھا۔ وہ اپنی زندگی پر غور کرتی تھی تو بے تامل یہ ماننا پڑتا تھا کہ زندگی نام ہے غلطیوں پر پچھتانے کا۔ اس کا دل بھی آج یہی کہہ رہا تھا کہ کوئی ایسی ظالم اور سفاک قوت ضرور ہے جو ہمارے ساتھ ٹھٹھا کر رہی ہے۔

بدورا اپنے خیالات میں محو تھی کہ سامنے جنگل میں سے ایک شخص چند دیہاتیوں کے ساتھ نکلا اور سڑک پار کرکے ایک کھیت میں رک گیا۔ یہ احمد تھا جو جنگل میں اپنے آدمیوں کو لئے ہوئے کچھ لکڑیاں کٹوا رہا تھا اور اب اپنے کھیت کا معائنہ کر رہا تھا۔ سر تا پا وہ بھیگا ہوا تھا۔ اس کی دھوتی اسکے بدن پر چپکی تھی لیکن انداز سے مترشح تھا کہ وہ اپنی اس حالت سے بے خبر نہیں تو بے پروا ضرور ہے۔ بدورا نے ایک مدت کے بعد احمد کو دیکھا تھا۔ احمد اب احمد نہ تھا بلکہ احمد کا بھوت ہو کر رہگیا تھا۔ اس کے بدن میں اب ہڈی اور چمڑے کے سوا گوشت کا کہیں نام نہ تھا۔ کلے بیٹھ گئے تھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ رنگ یرقانیوں کی طرح پیلا تھا چال میں سستی تھی معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ کا بیمار ہے اور وہ بیمار تھا بھی۔ اس کو بخار کا دورہ ہوا کرتا تھا لیکن جب افاقہ ہو جاتا تھا تو وہ پھر اسی طرح کاروبار میں مصروف ہو جاتا تھا تاکہ زندگی کی تکان نہ محسوس ہو۔ بدورا نے احمد کو دیکھا تو اس کی ہستی کی گہرائیوں سے ایک آہ نکل گئی۔ وہ بیتاب ہوگئی اور کہنے لگی "احمد تم کو میں نے غارت کیا ہے!" اور پھر کہا "لیکن میں نے اپنے کو بھی برباد کر ڈالا۔ آہ! یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد۔ اگر میں ضد کرتی تو باپ کو مجبور کر سکتی تھی کہ وہ میری شادی احمد ہی کے ساتھ کرے۔ اس وقت شاید یہ خرابیاں نہ پیدا ہوتیں۔ یہ سب اپنا ہی کیا دھرا ہے" احمد کھیت سے باہر نکل آیا اور امیر نگر کی طرف جانے لگا۔ بدورا جنگلے پر سے اٹھی اور ایک پرزہ پر یہ لکھا:۔

"بیا کہ دست دو لم می رود ز کار بیا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ اگر تم نہ آئے تو میں خود تمہارے پاس آؤنگی۔ بدورا"

پرزہ کو ایک لڑکے کے ہاتھ میں دیکر کہا "احمد باہر سڑک پر ہیں۔ یہ ان کو جا کر دے آؤ" لڑکا چلا گیا اور بدورا انتظار کرنے لگی۔ لیکن احمد نہیں آیا۔

احمد خط پڑھ کر سیدھا اپنے مکان چلا گیا تھا اور ایک نئی ادھیڑ بن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آج بے طرح وہ بدورا سے ملنے کے لئے بیتاب ہو رہا ہے۔ بدورا کی تحریر کا ایک ایک حرف نشتر تھا۔ جب اچھی طرح اندھیرا ہو گیا تو وہ اٹھا اور مالتی کے پاس جاکر کہا "مالتی آج بدورا نے مجھکو بلایا ہے۔ شاید وہ بیمار ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میں جاتا ہوں"۔ مالتی نے کہا "ہاں جائیے"۔ احمد چلا گیا۔ مالتی کو یہ تو علم تھا نہیں کہ بدورا محبت کی تجدید کرنے والی ہے تاہم اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اگر کچھ نئی پیچیدگیاں پیدا ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ مالتی کو پورا یقین تھا کہ احمد بدورا کا تباہ کیا ہوا ہے اگرچہ احمد اسکو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ سارا الزام مقدر کو دیتا تھا۔ اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے مقدر میں بدورا کی محبت کو بہت بڑا دخل تھا۔

بدورا احاطہ کی دالان میں بیٹھی ہوئی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ آج رات کو جب سب سو جائینگے تو وہ خود احمد کے پاس جائیگی۔ اتنے میں اُس کو مکان کے اندر قربان علی کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی ساتھ ایک اور نقیہ و کمزور آواز آئی۔ یہ احمد کی آواز تھی۔ بدورا دوڑ کر اس دروازہ پر آگئی جو مکان کے اندرونی حصہ میں کھلتا تھا۔ قربان علی کہہ رہے تھے۔ "احمد تمہاری حالت کیا ہے! تم قبر کے مردوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو۔ تمہاری صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ موت سر پر کھیل رہی ہے"۔

احمد نے کہا۔ "جی کچھ نہیں ادھر موسم کے اثر سے کئی روز تک بیمار رہا ہوں۔ اسی کی کمزوری باقی ہے"۔ قربان علی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "نہیں احمد اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے تمہاری اور بدورا دونوں کی زندگی خاک میں ملائی۔ میری بھی کیسی مت ماری گئی تھی۔ تم دونوں کی زندگی کیسی خوشگوار و خوش آئند ہوتی"۔

احمد اس کا جواب نہ دے سکا۔ اس نے بدورا کو دیکھ لیا اور اس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ اس نے قربان علی سے کہا "میں نے بدورا کو عرصہ سے نہیں دیکھا ہے۔ ذرا اس کو بھی دیکھ لوں"۔ قربان علی نے کہا۔ "جاؤ احاطہ میں ہی اپنی تقدیر کو رو رہی ہو گی۔ اب اس میں شگفتگی اور ترمی کا پتہ بھی نہیں ہے جو دوسروں کو شگفتہ کر دیا کرتی تھی"۔

احمد نے احاطہ میں بدورا کو تنہا پایا۔ جس بدورا کو احمد ایک پیکر رنگ و بو دیکھ چکا تھا آج وہ سراپا "ماتم دلبری" کی حدیث بنی ہوئی تھی۔ پھول سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ گالوں کی زردی آمیز سرخی کی وجہ سے چراغ کی روشنی میں بدورا ایک نئی چیز معلوم ہو رہی تھی۔ صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ مسلول ہے یہ منظر دیکھکر احمد کی روح اور بھی پژمردہ ہو گئی۔ وہ بڑی دیر تک بدورا کو سکتہ کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ بدورا بھی بغیر ایک حرف کہے اس کو دیکھتی رہی۔ دو تصویروں کا سامنا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گفتگو کیونکر شروع کیجائے۔ آخر کار احمد نے کہا "کہو کیسی ہو؟ کچھ بیمار سی نظر آرہی ہو کیا کوئی خاص شکایت رہتی ہے"۔ بدورا نے اپنی نگاہیں احمد پر جمادیں اور اس کا دل ٹٹولنے لگی۔ احمد اس وقت مجسم تکلف تھا۔ بدورا جانتی تھی کہ جب تک احمد سے طنزیہ لہجہ میں بات نہ کیجائے احمد پر جلدی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اُس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "خوب! آپ نے پوچھتے پوچھتے میری بات پوچھی بھی تو اس طرح کہ گویا ایک بوجھ تھا جسکو اُتار پھینکا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں تم

اپنا حال تو بیان کرو اس لئے کہ دیکھنے میں تم مجھ سے زیادہ رحم کے قابل ہو تمہاری اس وقت تو وہ حالت ہے جو مرنے والے کی چالیس دن پہلے ہوتی ہے"۔

احمد نے کہا کیوں بدورا آخر میرے کس جرم کی سزا میں ایسی کڑوی باتیں کر رہی ہو۔ میں تم سے اور کیا پوچھتا۔ تمہارے سب حالات تو جانتا ہی ہوں۔ رہگیا اپنا حال سو وہ چنداں قابل تشویش نہیں، ادہر کچھ دنوں سے علالت کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اسی کے یہ آثار ہیں"۔ بدورا خاموش اس کی صورت دیکھتی رہی۔ اسکی آنکھیں پر نم ہو چلی تھیں۔ اتنے میں اسکی نظر احمد کے کپڑوں پر پڑی جو تر تھے۔ اس نے کہا "احمد یہ کیا! تم تو شرابور ہو۔ کہیں اس ضعف میں کوئی خطرناک صورت نہ پیدا ہو جائے۔ میں جاتی ہوں اور ابا کا کرتا دہوتی لے آتی ہوں۔ ابھی کپڑے بدل ڈالو"۔ احمد نے منع کیا۔ مگر بدورا قربان علی کے کپڑے لے آئی اور اسکو اپنی بھیگے کپڑے اتارنے پڑے۔

بدورا نے احمد کو پان لگا کر دیا۔ اُس نے لینے میں عذر کیا۔ وہ پان نہ کھاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر ہو سکے تو حقہ منگاؤ مجھے کچھ سردی معلوم ہو رہی ہے"۔ بدورا نے حقہ منگوایا اور کہا۔ "لیکن جب میں نے پان لگا کر دیا کرتی تھی تو تم کھا لیا کرتے تھے۔ آج کیوں نہیں کھاتے"۔ احمد نے بغیر کچھ کہے ہوئے پان لے لیا۔ بدورا نے پھر کہنا شروع کیا"۔

تم جانتے ہو کہ میں تم سے ملنے کے لئے کیوں بیچین تھی؟ میں نے تم سے کیسی خوشامدیں کیں مگر تم نہ آئے تم کو مجھ پر ترس آیا میں جو کچھ تم سے کہنا چاہتی ہوں شاید اب تم اس کے سننے کے لئے تیار نہ ہوگے۔ بہر حال میں کہدینا چاہتی ہوں۔ جو حادثات مجھ پر سے گزرتے رہے ہیں۔ انھوں نے مجھکو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ زخمی دلوں پر اگر کوئی چیز مرہم کا کام کر سکتی ہے تو وہ محبت ہے۔ زندگی کے کانٹوں کو اگر کوئی چیز پھول بنا سکتی ہے تو وہ محبت ہے مختصر یہ کہ اگر مجھکو اب کوئی چیز سکون دے سکتی ہے تو وہ محبت ہے۔ میں محبت کی محتاج ہوں اور مجھکو اب پتہ چلا کہ میں در اصل تمہاری محبت کرتی رہی ہوں۔ تم کہو گے کہ جب ایک طرف سے مایوس اور نا امید ہو گئی تو پھر تمہاری طرف جھک پڑی۔ نہیں احمد مجھکو دہوکا تھا۔ مجھے ڈاکٹر سے محبت کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے اس کا دکھ نہیں ہے کہ میری شادی ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ نہیں بلکہ رونا اس کا ہے کہ میں نے تم کو مدت العمر کے لئے کھو دیا اور محبت سے مجبور ہو گئی۔ آج ڈاکٹر سراپا نیاز و نیائش بنکر بھی آئیں تو میری تسکین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ مجھکو اُن سے کوئی لگاؤ نہیں ہے مجھے تم جو چاہو کہو۔ دنیا اس کی جو تاویل چاہے کرے۔ لیکن احمد مجھکو تم سے محبت ہے۔ یہ کوئی گناہ نہیں جس کے لئے میں نادم ہوں ؎

فاش میگویم و از گفتۂ خود دلشادم    بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں اس حقیقت کو بھول گئی تھی میرے آئینہ پر زنگ آ گیا تھا جسکو زمانہ کی رگڑ نے پھر صاف کر دیا ہے۔ احمد میرے قصور کو معاف کر دو اور کہدو کہ تم بھی اب تک مجھکو اسی طرح چاہتے ہو پھر نہ میں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس کرونگی اور نہ میرا دل دکھیگا"۔ بدورا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اسمیں مبالغہ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی

جو واقعی بغیر محبت کے زندگی کو مصیبت سمجھتی ہیں۔ اس کو اپنی طبیعت نے کچھ دنوں کے لئے فریب میں ڈال رکھا تھا۔ اور یہ فریب اُس وقت دور ہوا جبکہ تیر شست سے چھوٹ چکا تھا اور اپنے ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔ احمد نہ جانے کیا کیا سوچ کر آیا تھا۔ بدورا کا یہ خروش دیکھکر سب بھول گیا اس کے اعصاب ڈھیلے ہوگئے اور اس نے بدورا کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا " بدورا جھوٹ بولنا یا بات کو چھپا ڈالنا میرا شیوہ نہیں۔ مجھے یہ اقرار کرلینے میں مطلق عار نہیں کہ (دل پر ہاتھ رکھکر) تم اب بھی اس ویرانہ کی سلطانہ ہو۔ مگر اب میری میری محبت تمہارے کس کام کی؟ یہ اجڑا ہوا دل تم کو کیا راحت یا سکون دے سکتا ہے۔ بدورا سچ تو یہ ہے کہ اب اگر اس پہلو میں دل بھی ہے تو دل میں وہ حوصلہ نہیں وہ تاب نہیں۔ میں اپنے دل کے خون میں آلودہ ہو کر اس منزل پر پہنچ چکا ہوں جہاں دنیا کی ہر چیز کی طرح محبت اور نفرت بھی بیگانۂ اصلیت ہے تم بھی محبت میں نوآموز ہو۔ یہ مجھ آزمودہ کار سے پوچھو۔ تم کو جہاں سبز باغ نظر آرہے ہیں وہاں میں ایک بسیط خارزار دیکھ رہا ہوں۔ نہیں بدورا محبت کی تلخی اور المناکی نسبتاً اس کے کیف و سرور سے کہیں زیادہ ہے۔ اور بلاؤں کی طرح محبت بھی ایک بلا ہے جو انسان کو ہلاک کرکے چھوڑتی ہے"۔

بدورا نے جواب دیا " اگر بلا ہے تو بلا ہی سہی۔ میں اب اگر جی سکتی ہوں تو محبت کے سہارے جی سکتی ہوں۔ میں تمہارے سہارے جی سکتی ہوں۔ میرے بیقرار دل کو تم آسودہ کر سکتے ہو۔ یہ وہ کام ہے جو کسی اور سے نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے کچھ اور نہیں چاہتی۔ بس مجھے چاہو۔ اسی طرح جسطرح پہلے چاہتے تھے میرے دل کو ہاتھ میں لو اور مجھکو بچالو۔ احمد میرے احمد

روزم تو بر فروز و شبم را تو نور دِہ   این کار تست کار مہ و آفتاب نیست

بدورا کی یہ ہذیانی کیفیت دیکھکر احمد کا دل بے قابو ہوگیا اور اس کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

تو اور حسرتِ ناز آہ کیا علاج کروں   میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل

بدورا کو یکایک مالتی کا خیال آگیا اور دفعتاً اس کا لب ولہجہ بدل گیا۔ اس نے حسرت سے کہا " مگر اب تو نہ کوئی امید ہے اور نہ کوئی وجہ کہ تم میرا خیال کرو۔ تم کو مالتی جیسی جانباز عورت ملگئی ہے۔ تم اپنے کو اس کے سپرد کر چکے ہو تم سے دلدہی کی آرزو کرنا بیکار ہے۔ میں تم کو کھو چکی ہوں اور اب پھر پانا محال ہے"۔

احمد بدورا کا یہ طعن نہ برداشت کر سکا اور کسیقدر تند ہو کر کہا " عمر بھر میں مجھکو کبھی ایسا صدمہ نہیں پہنچا تھا جیسا آج تمہارے ان الفاظ سے پہنچا ہے۔ تم کس منہ سے یہ کہتی ہو"۔

" میرا منہ تو ہرگز اس قابل نہیں کہ کچھ کہہ سکوں مگر واقعہ سے انکار بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ مالتی تمہاری صرف بیوی نہیں ہے اور سب کچھ ہے"۔ بدورا نے جواب دیا۔

احمد نے خشکی سے کہا " یہی ہوتا تو شاید میرے دل کو کچھ قرار میسر ہو جاتا۔ واقعہ یہ ضرور ہے کہ مالتی مجھے چاہتی ہے اور بری طرح چاہتی ہے۔ مگر میں اپنے دل میں کوئی ابھار نہیں پاتا۔ میں نے تم کو چاہا اور دل وجان سے چاہا۔ اب بھی چاہتا ہوں۔ اسکا پھل مجھکو مل گیا۔ اس سے انکار نہیں کہ میں نے مالتی سے شادی کا وعدہ کرلیا ہے۔ اور اگر کبھی اپنے کو اس قابل پاؤنگا تو

ماتی ہی کے ساتھ شادی کرونگا مگر بدورا محبت ایک بار کی جاتی ہے بار بار نہیں۔"

بدورا کو اس سے تسکین ہوئی اس نے کہا "خیر تمہارا جس سے جی چاہے شادی کرو۔ میں نہ اسپر کڑھنے کا حق رکھتی اور نہ اسکی مجھکو پروا ہے۔ شادی کا تجربہ میرے لئے کچھ حوصلہ افزا نہیں ثابت ہوا۔ میری اب اگر کوئی تمنا ہے تو یہ کہ تم میری محبت کرو اور مجھکو سنبھال لو۔"

احمد نے کہا "جیسا تمہارے لئے شادی کا تجربہ تھا ویسا ہی میرا محبت کا تجربہ تھا۔ شادی نے تمہیں برباد کیا۔ محبت نے مجھکو"

بدورا نے کہا "آہ ابا نے میری اور تمہاری دونوں کی زندگی خراب کی"

احمد نے کہا "بیکار کسی کو الزام کیوں دو۔ جو ہونا تھا وہ ہوا میں بارہا تم سے کہہ چکا ہوں کہ اس معمورۂ امروز و فردا میں اس دنیائے گرد و باد میں وہی ہوتا ہے جو بغیر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ کسی کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ ہوقت کف افسوس ملنا البتہ ہمارا کام ہے کسی نے سچ کہا ہے ؎

یاں کے سپید و سیہ میں ہمکو دخل جو ہے تو اتنا ہے     رات کو رو رو صبح کیا یا دنکو جوں توں شام کیا

اور کون جانے اتنا بھی دخل ہے یا نہیں۔" اس وقت احمد اپنے خاص رنگ کی باتیں کر رہا تھا۔ بدورا کو گزرا ہوا زمانہ یاد آ گیا مگر اب نہ وہ ان باتوں پر ہنس سکتی تھی نہ ان سے اختلاف کر سکتی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔ میری اپنی زندگی کے تجربات نے بھی مجھے اسکو ماننے پر مجبور کر دیا ہے۔ احمد اب مین تمہاری ہم اعتقاد ہوں۔ پیرو ہوں۔ مرید ہوں۔ زندگی حقیقت میں عذاب ہے۔ یہ ساری غلطی آدم کی ہے۔ جس کی پاداش ہم اب تک بھگت رہے ہیں۔ آدم ہی نے فردوس کو چھوڑ کر یہ کانٹوں کی دنیا بسائی۔ وہی ہمکو اس "خراب آباد" میں لائے۔ نہ وہ "شجر ممنوع" کا پھل کھاتے نہ ہماری یہ گت ہوتی۔"

بدورا احمد کو اس وقت مجسم معصوم معلوم ہو رہی تھی۔ اس کو ہنسی آ گئی لیکن اس کی ہنسی میں کوئی کیفیت نہ تھی۔ اس نے کہا "یہ تو میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ آدم نے غلطی کی لیکن میرے خیال میں اب کسی دوسرے "شجر ممنوع" کے پھل کھانے کی ضرورت ہے جس سے اس غلطی کا ازالہ ہو سکے۔ انسان کو نجات دلانے کے لئے ابھی ایک اور آدم کی ضرورت ہے۔"

رات زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش بند نہیں ہوئی تھی۔ احمد نے سائبان سے جھک کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "اچھا بدورا اب میں جاتا ہوں بڑی دیر ہو گئی۔ کل پھر آؤنگا۔"

بدورا نے کہا "اور آج اگر یہیں رہجاؤ تو کیا ہرج ہے؟ میں تمہارے لئے بچھونا باہر بچھوا دیتی ہوں۔"

نہیں میں ابو الخیر کا سامنا کرنا نہیں چاہتا" احمد نے کہا۔

"تو اس سے اطمینان رکھو۔ وہ آج دو روز سے گھر نہیں آئے ہیں اور نہ آج آنے کی کوئی امید ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ وہ کبھی نہ آئیں مگر نہ جانے وہ کس مصلحت سے ایک کچے دھاگے کا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔"

"مگر مجھکو جانے دو" احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔

اچھا جاؤ - مگر اس کا وعدہ کرتے جاؤ کہ یہاں سے جاتے جاتے مجھکو بھول نہیں جاؤ گے - میں تم سے بدگمان ہوگئی ہوں" بدورا پھر آنسو بہانے لگی -

احمد نے گھبرا کر کہا "نہیں نہیں مجھ سے قسم لے لو - میں آؤنگا - روز آؤنگا - دن میں دوبار آؤنگا یا جتنی بار کہو آؤنگا - میں تم کو نہ کبھی بھولا ہوں نہ بھولونگا - اگر یہی ممکن ہوتا تو میں اس حالت کو نہ پہنچ جاتا اور آج تم کو دیکھنے کے بعد تمہارے منہ سے "حرفِ آرزو" سننے کے بعد تمہارے خیال کو دل سے دور کرنا اور بھی غیر ممکن ہوگیا ہے" یہ کہکر اس نے بدورا کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور پھر یہ شعر پڑھا ؎

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم　　بھول جاتا ہوں مگر دیکھکے صورت تیری

بدورا بیتاب ہوگئی اور بیتابی میں احمد کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر اس طرح چوما کہ اس کی پیشانی جلنے لگی - اس کے بعد اس نے کہا "جاؤ اب اگر تم انسان ہو تو مجھکو کبھی نہ بھولو گے یہ ایک بیاہی ہوئی عورت کے بوسے ہیں جو بوسہ کی اہمیت کو سمجھتی ہے"

بدورا نے سچ کہا تھا - احمد کا جنون تازہ ہوگیا اور وہ ان بوسوں کی لذت کو نہ بھول سکا -

اس دن احمد نے تمام رات آنکھوں میں بسر کردی وہ سوچتا تھا کہ اب کیا کرے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا - آسمان کی یہ ستم ظریفی اب حد سے بڑھ چلی تھی - احمد یاس و حرماں سے مانوس ہو چلا تھا - قدرت اس سے پھر برسرِ پیکار ہوگئی اور اس کے دل میں از سرِ نو خلشِ تمنا پیدا کر اس کو کرب و اضطراب میں ڈالدیا - احمد صبح تک غور و تفکر میں پڑا رہا - آخر کار ایک فیصلہ پر پہنچ گیا - اُس نے قلم دوات منگا کر "بیگم" کے نام اس عبارت کا ایک خط لکھکر روانہ کیا -

بیگم صاحبہ - میری عقل کام نہیں کرتی کہ میں آپ سے اپنا مطلب کھلے الفاظ میں کیونکر بیان کروں - آپ کچھ نہ کچھ تو سمجھ بھی گئی ہونگی - زیادہ تشریح کی حاجت نہیں - آپ کے جو الطاف و احسان مجھ پر ہیں اس کے بوجھ سے میری گردن ہمیشہ جھکی رہیگی - میری ایک استدعا آپ سے اور ہے اور غالباً یہ آخری استدعا ہے - آپ بدورا کی حالت پر رحم کیجئے اس کی حالت خراب ہے اور مجھ سے دیکھی نہیں جاتی - آپ اگر اس پر رحم کریں گی تو یہ دراصل مجھ پر رحم ہوگا - میں ایسا ہی مجبور ہو گیا ہوں جو آپ کو یہ لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں - اب ابوالخیر کو اپنے جان و مال کے صدقے میں بھیک سمجھکر بدورا کو دیدیجئے - اس کی زندگی بچ جائیگی - اور ممکن ہے آپ کے حق میں بھی یہ بہتر ثابت ہو - اس خط کا ذکر کسی سے نہ کیجئےگا -

نیاز کش

احمد

احمد نے خط کو گاؤں کی ایک عورت کے سپرد کیا اور تاکید کردی کہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ دینا -

## ۱۲

عائشہ یوں تو جب کبھی ابوالخیر کی غیبت میں اپنے اور اس کے تعلقات پر ہوش و حواس اور سنجیدگی سے غور کرتی تھی تو اس کی روح مضمحل ہو جاتی تھی۔ وہ ایک عصبی عورت تھی مگر جب کبھی اس کو اپنے دل پر قابو ہوتا تھا تو اُس کو ندامت ہونے لگتی تھی۔ بدور اسے اس کو رقیبانہ جلن ہرگز نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ابوالخیر پر اس کو کوئی حق نہیں ہے۔ اس کو پورا احساس تھا کہ وہ بدور اپر ظلم کر رہی ہے جس کا مواخذہ اُس کو دینا ہے۔ آج احمد کا خط اس کو ملا تو اسکو اپنی ذات سے شرم آنے لگی اور اس کی پیشانی نم آلود ہو گئی۔ اُس کو اپنی ذات سے نفرت معلوم ہونے لگی۔

ابوالخیر اُسدن علی الصباح بستی چلا گیا تھا اور دس بجے رات کی گاڑی سے پہنچنے والا تھا۔ عائشہ کو دیر تک سوچنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے احمد کی بھیجی ہوئی عورت کو بلا جواب کے واپس کر دیا تھا۔ اور خود اس پیچیدہ مسئلہ کا حل سوچنے لگی تھی۔ بڑے غور و تامل کے بعد اس نے اپنے آدمی کے ہاتھ یہ خط احمد کے پاس لکھ بھیجا۔

پیارے احمد۔

میں صرف تم سے یا بدور اسے نہیں بلکہ دنیا کی ہر چیز سے شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنی زندگی ہی شرمناک معلوم ہوتی ہے۔ تمہارا خط بڑا پیارا اور اثر کرنے والا تھا۔ اس نے میرے ساتھ وہ کام کیا "جو آسمانی جھڑکیاں" بھی نہ کر سکتی تھیں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ آئندہ کیا کرنا چاہتی ہوں۔ ایک بار تمہاری بدور سے مل کر دو دو باتیں کر لینا ضروری سمجھتی ہوں۔ مجھکو یقین ہے۔ کہ بدور "نصیر کوٹ" میں مجھ سے ملنا پسند نہیں کریگی اور نہ قربان علی اس کی اجازت دینگے اُن کو یہ ڈر لگا رہیگا کہ میں ان کی بیٹی کو کہیں زہر نہ دیدوں۔ اور میں بھی ان کے مکان میں قدم رکھنا غیر مناسب سمجھتی ہوں۔ لہذا تم اگر کسی طرح اپنے مکان میں بدور اکو بلا لو تو میں غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے آکر مل لوں۔ اگر ملاقات ٹھہر جائے تو مجھکو اطلاع دیدینا۔

تمہاری مخلص
عائشہ

احمد خط کو پڑھکر سیدھا بدور اکے پاس گیا اور خط اس کو دے کر کہنے لگا "بدور ا میں بھی اس ملاقات کو بہت ضروری سمجھتا ہوں"۔ بدور انے پہلے تو صاف انکار کر دیا۔ قربان علی نے بھی اختلاف کیا مگر پھر احمد کے اصرار سے دونوں راضی ہو گئے۔ قربان علی نے کہا میں بھی چلونگا اور تمہارے پاس بیٹھا ہونگا۔ احمد قربان علی کے وہاں سے کچھ دری قالین لیکر چلا گیا اور مکان کو سیدھے سادے طور پر آراستہ کر دیا۔ قربان علی بدور اکو لیکر تیسرے پہر ہی کو احمد کے مکان میں پہنچ گئے۔ بدور ا متفرق کاموں میں احمد کی مدد کرنے لگی۔ اس طرح اس کی طبیعت بہل گئی اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی ناکامیوں کو بھول گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد

وہ احمد سے اس قدر قریب ہوئی تھی۔ اور اب اس کو اس قرب میں ایک نئی لذت مل رہی تھی جسمیں وہ محو تھی۔ مالتی کو معلوم تھا کہ مکان میں آج بدورا آئی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ پہلو بچا گئی اور اس دن قصداً احمد کے پاس نہیں آئی۔ احمد کو اس کا خیال بھی نہ آیا وہ بھی بدورا میں کچھ کم محو نہ تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ ہر شخص چشم براہ وگوش برآواز تھا۔ اتنے میں کہاروں کی آہٹ ملی اور "بیگم" کی شاندار پالکی نظر آئی۔ احمد نے اندر جاکر بدورا کو اطلاع دی۔ بدورا گھبرانے لگی۔ قربان علی بھی سراسیمہ ہوگئے۔ بدورا کا خیال تھا کہ عائشہ لاکھ خوبصورت ہو مگر اس سے پھر بھی کم ہوگی۔ اس لئے کہ وہ سن چکی تھی کہ اس کی عمر ۲۸، ۲۹ برس کی ہے۔ اور اس کے ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا۔ بدورا کی حیرت کی انتہا نہ تھی جب اس نے دیکھا کہ پالکی سے ایک چھریرے بدن کی میانہ قد پتلی دبلی سراپا حرکت واضطراب عورت اتری اور تپاک سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کا جسم نور کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا اور کسی طرف سے بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بدورا سے سن میں بڑھی ہے۔ بدورا کی حیرت کم ہوئی تو اس کے برتاؤ میں کشیدگی تھی۔ عائشہ نے بدورا کو گلے لگانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائے تو بدورا جھجک گئی۔ عائشہ نے اس کا مطلق برا نہ مانا اور پرخلوص لہجہ میں کہا "ہاں تم کو مجھ سے عداوت ہے اور ہونی بھی چاہئے میں اس کی سزاوار ہوں۔ لیکن مجھکو تم سے عداوت نہیں ہے۔ نہیں مجھکو تم سے محبت ہے مجھے تمہارے ساتھ غائبانہ انس تھا۔ میں تمہاری صورت اپنے ذہن میں پھرایا کرتی تھی۔ میں نے تم کو اپنے قیاس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور بھولا پایا۔ تم تو موم کی گڑیا ہو" اس کی آواز میں درد تھا۔ اس نے پھر ہاتھ پھیلا دئے۔ بدورا کی جھجھک دور ہوگئی تھی اس نے بھی عائشہ کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔ عائشہ کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ بدورا حیران تھی کہ آخر یہ کس قسم کی عورت ہے۔

جب دونوں ایک دوسرے سے کسی قدر مانوس ہوگئیں تو عائشہ نے اطمینان سے بیٹھکر کہنا شروع کیا "اس محبت اور خلوص کے باوجود جانتی ہوں میں تم سے کیا کہنے آئی ہوں۔ میں ابوالخیر کو چھوڑ نہیں سکتی۔ وہ مجھکو کھو کر ملا ہے۔ میں اب اس کو تمہارے حوالہ نہیں کرسکتی" عائشہ یہ کہکر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں شرارت تھی۔

بدورا سمجھی کہ اس کے ساتھ تمسخر کیا جارہا ہے۔ اس نے جواب دیا "تو یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے لئے آپ آنے کی زحمت گوارا کرتیں۔ یہ میرے لئے کوئی نئی خبر نہیں ہے۔ آپ نے ناحق تکلیف فرمائی"۔

"ایسی خشونت ٹھیک نہیں" عائشہ نے افسردہ ہوکر کہا "میرے خلوص اور صدق نیت کا جواب تو یہ نہ تھا۔ میں تو تم کو آزماتی تھی۔ تم کمزوریوں کو معاف کرنے والی عورتوں میں نہیں ہو۔ خیر اس قدر برافروختہ نہ ہو مجھے بھی اپنی عزت نفس کا پاس ہے۔ میں بھی خوددار ہوں۔ در اصل مجھکو وہ کہنا نہ تھا جو میں نے کہا ہے۔ میں کچھ اور کہنے آئی تھی"۔

عائشہ مجسم پندار وحقارت بنگئی تھی۔ اس کو بدورا کے طنز سے سخت تکلیف پہنچی تھی۔ بدورا کو پھر شرمندہ ہونا پڑا۔ عائشہ بدورا کے لئے ایک چیستاں تھی۔ اس کی الٹی سیدھی باتوں سے وہ الجھ رہی تھی۔ بدورا اپنی ندامت دور کرنے کے لئے کچھ ناشتہ لے آئی اور عائشہ سے کہا "اچھا آئیے اس کے ساتھ کچھ شغل کیا جائے۔ اور اسی دوران میں آپ وہ بھی کہدیجئے گا جس کو ابھی تک چھپا رکھا ہے"۔

عائشہ نے کہا "اس کی ضرورت نہ تھی۔ اور میں اس کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگاؤنگی جبتک کہ تم میرے ساتھ کماحقہ ہمدردی کا وعدہ نہ کرو گی۔ تم نے ابھی زمانہ کا نیچا اونچا نہیں دیکھا ہے اس لئے سختگیر ہو۔ کسی کا دکھ درد نہیں سمجھ سکتی۔ کسی کی غلطیوں کا احترام نہیں کر سکتی۔ زمانہ کو اگر موقع ملا تو وہ یہ سب تم کو سکھا دے گا" بدورا کی پشیمانی بڑھ رہی تھی عائشہ کی نرم جھڑکیاں اس کیلئے زہر میں بجھے ہوئے نشتر سے کم نہ تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسی باتوں کا جواب کس پیرایہ میں دیا جائے۔ اُس نے سنجیدگی کیساتھ کہا "بیگم صاحبہ آپ کو جو کچھ کہنا ہے بے تامل کہدیجئے۔ میں سننے ہی کے لئے نہیں بلکہ آپ کے ایک ایک حرف سے ہم آہنگ ہونے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے آپ سے ہرگز کوئی شکایت نہیں۔ آپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جو عفو طلب ہو اور اگر کی ہے تو میں نے اُس کو معاف کیا"

عائشہ نے بدورا کو غائر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم معاف کرو یا نہ کرو۔ تم میری ہم آہنگ بنو یا نہ بنو۔ تم مجھکو جو جی چاہے سمجھو اب تو میں اپنی روداد سے تم کو آگاہ کر دینے کا ارادہ کر چکی ہوں اور رودیہ ہے" اس نے اپنی پوری سرگزشت من وعن بیان کر دی۔ بدورا بے حس وحرکت سنتی رہی عائشہ نے سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے کہا:۔

"بدورا! ابو الخیر تم جیسی معصوم بھولی بھالی بچی کے لائق ہرگز نہیں ہے۔ وہ پرفن ہے۔ زمانہ ساز ہے محبت کی لذتوں سے اجنبی ہے۔ وقتی اور موسمی تاثیر و تاثر کا غلام ہے۔ اس کی کسی بات کو ثبات نہیں ہے۔ اس کا عشق ایک آنی و فانی جوش ہے جسکی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ میں جانتی ہوں اور پھر بھی اس سے دست بردار ہونا میرے حق میں موت کا حکم رکھتا ہے۔ اور وہ میرے ہی منہ لائق ہے بھی۔ میں ایک کھوئی ہوئی عورت ہوں۔ مجھے اپنے اعصاب پر قابو نہیں ہے۔ ابو الخیر کو دیکھکر جو شورش میرے اندر اٹھ جاتی ہے میں اس کو دبا نہیں سکتی۔ اس کے مے آلود ہونٹوں اور فتنہ بار آنکھوں کے تصور سے میرے جسم کے ایک ایک ذرہ میں جو ہلچل مچ جاتی ہے اُس کو روک نہیں سکتی۔ ہاں میں اس کی صورت کی تباہ کردہ ہوں۔ دہلی میں اس کی صورت کے ہاتھوں مٹی اور ذرا تماشا دیکھنا اب بھی اس کی صورت کی پجاری ہوں۔ میں نے اس سے اپنا بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی۔ اور دیکھتی ہوں بدورا میں اب بھی اپنے غارتگر کے پنجہ میں ہوں میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔ میں ابو الخیر کو نہیں چھوڑ سکتی "ترک آرزو" میرے لئے دشوار ہے۔ لیکن نہیں میں اس کو چھوڑ دوں گی۔ تمہارے لئے چھوڑ دونگی۔ بدکرداریوں کا یونہی بار گراں میرے سر پر ہے تم کو خراب کر کے۔ تم پر ظلم کر کے میں اپنے بوجھ کو اور بھاری نہ بناؤنگی۔ میں روپوش ہو جاؤنگی۔ ابو الخیر میرا پتہ نہیں پائیگا۔ کچھ دنوں میں خود بخود وہ راست پر آ جائیگا" عائشہ اب رو رہی تھی۔

بدورا کا دل دکھا ہوا تھا۔ اس کو رحم آگیا۔ وہ اپنا صدمہ بھول گئی۔ اس نے بیگم کو لپٹا کر کہا "میں اس کو نہیں دیکھ سکتی جس شخص کی مجھ سے زیادہ آپ کو ضرورت ہے اس کو آپ سے نہیں چھین سکتی۔ اگر دنیا کے رسوم کے مطابق مجھے آپ سے زیادہ حقوق حاصل ہیں تو ہونے دیجئے میں اُن سے غلط فائدہ نہیں اٹھانا چاہتی۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں" عائشہ کا دل ٹھہر گیا۔ اُس نے اپنے کو بدورا کی آغوش میں رہنے دیا اور پھر کہا "مجھے ایک اور بات کہنی ہے جسکو میں نے اب تک چھپا رکھا ہے

اور جو مجھکو اندر ہی اندر سلگا رہی ہے" یہ کہکر وہ رک گئی جیسے بس دبیش کرتی ہو۔ اس کے بعد اس نے جھک کر بدورا کے کان میں کچھ کہا۔ بدورا چونک کر عائشہ سے الگ ہوگئی۔ عائشہ نے متوحش ہو کر پوچھا تو کیا مجھے تم پر اپنا راز افشا نہ کرنا چاہئے تھا؟ کیا میں نے دہوکہ میں تم پر اعتبار کر لیا؟ کیا تم مجھکو رسوا کردوگی اور رحم نہ کھاؤگی؟"

بدورا کو فوراً احساس ہوگیا کہ اس نے چونک کر ایک غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ اُس نے اپنے حواس درست کر کے کہا۔ "آپ کو یہ مغالطہ ہوا۔ میں یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس لئے حیرت میں چونک پڑی۔ مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے خلوص ہے۔ محبت ہے۔ مجھے اپنا رازدار و غمخوار سمجھئے"۔ عائشہ کو اطمینان ہوا۔ اس روگ کو میں چار مہینہ سے پال رہی ہوں۔ میرا آغاز و انجام یکساں ہے۔ مجھے ہر طرف تاریکی نظر آرہی۔ میں اب کہیں کی نہیں رہی"۔ عائشہ نے سلسلہ ختم کر دیا اور بدورا کا منہ دیکھنے لگی۔

بدورا کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے کہا "اب آپ کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ جسطرح اب تک آپ بسر کرتی رہی ہیں اب بھی بسر کیجئے۔ میں اپنی نامرادزندگی سے مانوس ہوگئی ہوں میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی کینہ نہیں ہے"۔

خیر میں سوچونگی کہ میرے اور تمہارے حق میں بہترین صورت کیا ہوسکتی ہے"۔ عائشہ نے ایک سرد آہ کر کے جواب دیا۔

## ۱۳

ابوالخیر تین چار روز تک سرگرداں رہا۔ "بیگم" کا کہیں پتہ نہ تھا۔ "نصیر کوٹ" کے خدمتگاروں سے اُس نے دریافت کیا۔ انھوں نے ٹھیک نہیں بتایا۔ وہ ایک دن صرف دو روز کے لئے بستی گیا تھا اور اس قلیل عرصہ میں یہ انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ عائشہ اس کے نام ایک رقعہ چھوڑ گئی تھی۔ وہ یہ تھا۔

> تم میرا بیکار پیچھا نہ کرنا۔ مجھکو پا نہیں سکتے۔ میرے حق میں یہ بہتر ہو یا نہ ہو۔ بدورا کی بہبودی میں ہے۔ میں بدورا کی شادکامی کو مقدم سمجھتی ہوں۔ تم اس کے ہو۔ یہ میری زبردستی تھی کہ تم پر قبضہ کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ اب تم اس کے ساتھ آرام و سکون سے رہو۔ تم کو اس کی قدر ہونی چاہئے۔ ایسی بیوی کسی کو قسمت سے ملتی ہے۔ میری فکر نہ کرو۔ خود مجھکو اپنی فکر نہیں رہی۔ سمجھو کہ مجھکو زمین کھاگئی۔ میری خاک کو آسمان اڑا لیگیا۔ مجھکو یقین ہے کہ تم مجھکو بہت جلد بھول جاؤگے اس لئے کہ تم کو دراصل مجھ سے محبت نہیں ہے۔ محبت ہوتی تو پہلے ہی میری خبر لیتے اور اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر دہلی سے بھاگ نہ جاتے۔ مجھکو البتہ تم سے محبت تھی۔ محبت کیا خاصا جنون تھا۔ اور اب بھی۔ مگر میں نے اپنی طبیعت پر جبر کر لیا ہے۔ اور تم کو بدورا کے سپرد کر کے صبر کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار دینے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم بھی

مجھکو اپنے حال پر نہ چھوڑ دو۔ للہ اب مجھکو زیادہ آزمائش میں نہ ڈالنا۔ میں نے ایک سیدھا راستہ اپنے لئے نکال لیا جسپر ثابت قدم رہنا چاہتی ہوں۔"

تمہاری ستائی ہوئی

عائشہ

مگر ابوالخیر عائشہ کو اس آسانی سے چھوڑنے والا نہ تھا۔ عائشہ ایک "سونے کی چڑیا" تھی جس کا تعاقب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے ایک ملازم کو روپیوں کا لالچ دے کر عائشہ کا پتہ معلوم کر لیا۔ عائشہ اپنے مکان میں قفل دے کر اور مختصر سامان لیکر اپنے ایک دوسرے گاؤں میں چلی گئی تھی۔ جو شاہ آباد کہلاتا ہے اور جو کٹک پور کے دکھن جانب بارہ تیرہ کوس کے فاصلہ پر گھاگھرا کے کنارے واقع تھا۔ عائشہ نوکروں سے تاکید کر گئی تھی کہ کسی کو اس کی بود و باش کی صحیح اطلاع نہ دی جائے۔ شاہ آباد ایک اجڑا دیار تھا اور اب مہذب انسان کا وہاں گزر مشکل سے ہوا کرتا تھا۔ شاذ و نادر ہی کبھی کوئی "سفید پوش" ادھر سے آنکلتا تھا۔ عائشہ کا خیال تھا کہ ابوالخیر اس دشوار گزار وادی کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کی زحمت گوارا نہ کرے گا۔

ابوالخیر دو مہینہ تک انتظار کرتا رہا۔ اس کو توی امید تھی کہ عائشہ اس کے لئے بیتاب رہیگی اور آخر کار مجبور ہو کر پھر اس سے آملے گی۔ لیکن جب عائشہ کیا عائشہ کی گرد بھی نہیں آئی تو اس نے سوچا کہ اب جو کچھ ہو وہ خود جائیگا اور یا تو اس کو لے آئیگا یا وہیں اس کے ساتھ رہنے لگے گا۔ بدور سے اس نے کہا "میں دو چار روز کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ اور ممکن ہے اس سے زیادہ دن لگ جائیں۔" بدور سمجھ گئی کہ ابوالخیر عائشہ کی تلاش میں جا رہا ہے

عائشہ نہ جانے کس طرح اپنے دل کو سنبھالے ہوئے ابوالخیر کی جدائی گوارا کئے ہوئے تھی اور دعا کر رہی تھی کہ خدا مجھ کو اپنے ارادہ میں کامیاب رکھ اور ابوالخیر کی کافر آنکھیں پھر نہ دکھا۔" لیکن منہ مانگی دعا قبول کب ہوتی ہے انہیں ہلکا نیوالی آنکھوں کا پھر سامنا تھا۔ ابوالخیر کے شاہ آباد پہنچتے ہی عائشہ کے دل میں وہی ہیجان شروع ہو گیا تھا۔ اسپر ابوالخیر نے کچھ ایسا افسوں پھونکا کہ عائشہ پھر اس کے بس میں ہو گئی۔ اس نے کہا "عائشہ تمہاری یہ بدگمانی بے بنیاد ہے کہ مجھکو تم سے محبت نہیں ہے۔ تم میری زندگی میں ایک ضروری چیز ہو کر رہ گئی ہو۔ میں تم کو اب ہرگز نہیں جانے دونگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہمارا اس جوار میں رہنا ٹھیک نہیں۔ خواہ مخواہ کی بدمزگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خدا نے ہم کو کافی دولت دی ہے۔ آؤ ہم کچھ دنوں کے لئے کسی دوسرے شہر میں چلے چلیں جب یہاں کی شورش دب جائے تو پھر چلے آئیں گے۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ بدور کو مناسب موقع دیکھکر وہیں سے طلاقنامہ بھیجدونگا۔ پھر اس کی زندگی کا بھی میں ذمہ دار نہ رہونگا اور تمہارے دل سے ایک بوجھ ہلکا ہو جائیگا۔ اور اب اگر تم میرے ساتھ شادی نہ کروگی تو اور کیا کروگی۔ دنیا کی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ میں تم کو نہ چھوڑوں۔"

عائشہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ راضی ہو گئی اگرچہ اس کا حزن و ملال دور نہ ہو سکا۔ ابوالخیر نے ایک ہفتہ شدید مصروفیت اور دوڑ دھوپ میں گزارا۔ ضروری سامان سفر درست کر کے وہ عائشہ کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ چلتے ہوئے اس نے

بدورا کو اطلاعی خط لکھدیا تھا جس میں اس کا کوئی ذکر نہ تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ اس نے طلاق کا وعدہ ضرور کیا تھا جس سے بدورا اور قربان علی دونوں کو اطمینان ہوگیا تھا۔

ابوالخیر نے بمبئی میں بھی اپنا مطب کھول دیا تھا اور کمانے لگا تھا۔ عائشہ گزشتہ جھگڑوں کو بھول چکی تھی۔ اس کو اب اگر کوئی خلش تھی تو یہ تھی کہ ابوالخیر نے اب تک بدورا کو طلاقنامہ بھیجا تھا اور نہ اس سے باقاعدہ نکاح کیا تھا۔ وہ جب کبھی ابوالخیر سے اس کا ذکر کرتی تو ابوالخیر اس کا منہ چوم کر کہتا "سب کچھ ہوجائیگا۔ جلدی کا ہیکی ہے؟ کیا تم کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے" بیچاری خاموش ہوجاتی تھی۔ مگر اس کی خلش دور نہ ہوئی تھی۔ ابوالخیر عائشہ کے ساتھ اس طرح رہتا تھا کہ ہمسائے سمجھتے تھے عائشہ اسکی بیوی ہے عائشہ کا برتاؤ بھی اس کے ساتھ وہی تھا جو ایک بیوی کا شوہر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عائشہ تین چار مہینہ میں اپنے بار سے سبکدوش ہونے والی تھی۔ محلہ والوں کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ ابوالخیر عنقریب باپ بننے والا ہے۔

## ۱۴

مالتی ایک ہندو عورت تھی اور محبت میں ستی ہوجانے کا جذبہ اس کی گھٹی میں نہیں اس کی رگوں کے خون میں ساری تھا۔ وہ اپنا دل دوسرے کے ہاتھ میں دے چکی تھی اور اب اس کی جو حالت تھی اُسکو صرف "حیرانی" یا انفعالیت کہہ سکتے ہیں۔ اُس نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ احمد اس کی محبت سے گھبراتا ہے وہ احمد کی بار خاطر ہونا نہ چاہتی تھی۔ احمد وفا سے بیزار تھا۔ مالتی وفا کو بھی چھوڑ دینے کے لئے تیار تھی۔ اُس نے عزم کرلیا تھا کہ احمد کا جوگ لے لیگی۔ دنیا کو تج دیگی مگر احمد سے اپنی شکستگی کی داد نہ چاہیگی۔ مالتی کو معلوم تھا کہ لوگ بدورا کو طلاق دلانیکی فکر میں ہیں۔ ایسی حالت میں بدورا احمد کے ساتھ بیاہی جائیگی اور احمد اپنی لٹی ہوئی دولت پھر پالیگا۔ مالتی نے احمد کے وہاں آمد و رفت آہستہ آہستہ کم کردی تھی اور اب بہت کم اس کو اپنی صورت دکھاتی تھی تاکہ کوئی کمزور سے کمزور رکاوٹ اس کی ذات سے احمد اور بدورا کے راستہ میں نہ پیدا ہو۔ احمد اَب بھی اس سے مل لیا کرتا تھا اور اس کا حال پوچھ لیا کرتا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو مالتی کا اب بھی اسیطرح خیال ہے۔ مگر مالتی خوب سمجھتی تھی کہ یہ احمد کی وضعداری ہے اور اس دن جنگل میں اس نے جو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اسی کی لاج ہے۔

احمد کی عجیب حالت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس گتھی کو کیونکر سلجھائے۔ مالتی سے اب تک وہ شادی کی نیت رکھتا تھا۔ لیکن گزشتہ چند دنوں میں جو نئی صورت پیدا ہوگئی تھی وہ اُس کو ایک کروٹ چین سے نہ رہنے دیتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اَب اس کی محبت میں وہ جوش یا تلاطم نہ تھا۔ تاہم اس کو اگر کسی کا گرویدہ کہا جاسکتا تھا تو بدورا کا۔ یہ بدورا کی محبت تھی جس نے اس کے قلب میں ایسی چوٹ۔ ایسی گھلاوٹ ایسی خستگی و برشتگی پیدا کردی تھی۔ اور یہ بدورا کی محبت تھی جو آج بھی اسکی زندگی کی تمام کربنی ہوئی تھی۔ بدورا اس کے لئے اب بھی بدورا تھی وہ بدورا کے ہاں روزانہ نہیں تو دوسرے دن ضرور جانے لگا تھا۔ وہ بھی بدورا کے طلاق کا چرچا سن رہا تھا اور اُس سے اس کی الجھن بڑھ رہی تھی۔ وہ بدورا سے

منہ نہ موڑ سکتا تھا اسلئے کہ وہ بدورا کو پوجتا تھا۔ لیکن مالتی کو کیا کرے؟ اس سے کیسے آنکھیں پھیرلے؟ مالتی اپنی محبت کا نقش اس کے دل پر جما چکی تھی۔ غرضکہ احمد ایک ایسی کشمکش میں تھا کہ کسی طرف سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگ نہ سکتا تھا۔ اس کی تندرستی روز بروز خراب ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کو اکثر اپنی موت کا خیال آجاتا تھا اور وہ کبھی تو اس خیال سے افسردہ ہوجاتا تھا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے بدورا سے جدا ہونا پڑے گا اور کبھی یہ سوچکر خوش ہوجاتا تھا کہ چلو اس طرح ایک لاینحل مسئلہ حل ہوجائیگا

ابوالخیر نے طلاق کا جو وعدہ کیا تھا اس سے قربان علی کو بڑی ڈھارس بندھ گئی تھی اور بدورا تو گویا جی ہی اٹھی تھی۔ قربان علی تو یہ طے کر چکے تھے کہ اپنی بدورا کو احمد کی امانت سمجھ کر اس کے حوالہ کردیں گے۔ انھوں نے اس ارادہ کا اظہار کسی سے نہیں کیا تھا مگر ہر شخص اُس کو سمجھے ہوئے تھا۔ خود احمد کو بھی معلوم تھا کہ قربان علی زبان سے کہیں یا نہ کہیں مگر ان کی نیت یہی ہے۔ بدورا نے اس دن احمد سے کہنے کو تو کہدیا تھا کہ تمہارا جس کے ساتھ جی چاہے شادی کرو۔ مجھکو اسکی پروا نہیں لیکن اب اسکو یقیناً اسکی پروا تھی۔ شاید اس دن بھی پروا تھی اور احساس نہ تھا اس نے اپنی بات واپس لینا مناسب نہ سمجھا۔ احمد سے اس نے اپنی خواہش کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا بلکہ اپنی دلنوازیوں اور دلربائیوں سے اسکی کوشش کرنے لگی کہ احمد خود بخود بلا کسی سخت تحریک کے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لینے کے لئے تیار ہوجائے۔ ہکو کامل یقین تھا کہ اس کی یہ ادا کارگر ہوجائیگی۔ احمد بعض اوقات تو بدورا کی "پرکار سادگیوں" سے اس طرح مسحور ہوجاتا تھا کہ اب کبھی اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکیگا لیکن اب اس کی یہ سپردگی پائدار نہ ہوتی تھی۔ وہ بہت جلد اپنے ہوش میں آجاتا تھا اور اس کی محویت اسپر پھر مستولی ہوجاتی تھی۔ بہرحال بدورا کو اُمید تھی کہ وہ اپنی مسلسل کوششوں سے احمد پر فتح پالیگی۔

ایک دن احمد کئی دن کے بعد بدورا سے ملنے گیا۔ بدورا نے شکایت کا دفتر کھول دیا۔ احمد کو بخار آگیا تھا اسی وجہ سے وہ اتنے دن تک بدورا سے نہ مل سکا تھا مگر اُس نے اپنی اصل حالت کو چھپا کر کہا۔ ادھر مجھکو کچھ نہایت ضروری کام تھے اور میں نہ آسکا۔ بدورا نے عذر قبول کرلیا اور احمد سے بے تکلف ہوکر ملنا چاہا۔ وہ اپنے کو احمد کا سمجھنے لگی تھی۔ احمد نے متفکرانہ لہجہ میں کہا ہم کو ایک دوسرے سے اتنا بے تکلف نہ ہونا چاہئے ہمکو اس کا کوئی حق نہیں حاصل ہے۔ تم ابھی ابوالخیر کی بیوی ہو بدورا کا دل سرد ہونے لگا۔ احمد کو جب کبھی بدورا خود اس کا پیار کرلیتی یا اُس سے محبت کی باتیں کرتی تو وہ کوئی مزاحمت تو نہ کرتا تھا مگر اس کے تیور سے پایا جاتا تھا کہ اب اس کو ان باتوں سے تکلیف نہیں تو پریشانی ضرور ہوتی ہے۔ محبت کے اس نشاۃ الثانیہ میں احمد نے ایک بار بھی بدورا کو اگلی سی گرمجوشی کے ساتھ پیار نہیں کیا تھا اور نہ دل کھول کر اس سے باتیں کی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر محبت نے جوش کیا تو بدورا کے سر پر ہاتھ پھیر دیا جسوقت وہ ہاتھ پھیرتا تھا اس کی صورت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی سراپا حسرت و حرماں ہوجاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پچھلی ہستی اپنے پورے زور کے ساتھ ابھرنا چاہتی ہے اور ابھر نہیں پاتی۔ احمد آج خلاف معمول بدورا کے اظہار جذبات کو ناجائز سمجھ رہا تھا۔ بدورا کو اس کا ملال ہوا اس نے کبیدہ خاطری سے کہا:۔ احمد تم مجھکو اب چاہتے نہیں۔ خطاوار میں ضرور ہوں۔ لیکن تم نے تو معاف کردیا تھا اب اس کشیدگی کے

کیا معنے؟ تم نے اس دن ایک طرح سے میری دعوت محبت قبول کر لی تھی۔ پھر یہ انحراف کیوں؟ احمد کیا تم نے درحقیقت مجھکو معاف نہیں کیا ہے؟ کیا میں تم سے امیدیں نہ لگاؤں؟ میں تو یہ سمجھنے لگی تھی کہ میری زندگی کی منحوس گھڑیاں گزر چکی ہیں اور اب مبارک ساعتیں آرہی ہیں۔ کیا میرا یہ سمجھنا غلطی ہے؟ کیا میری امیدیں بے بنیاد طلسم کی طرح ٹوٹنے والی ہیں؟ کیا تم از سرنو میری زندگی کو پر کیف نہیں بنا سکتے؟"

بدورا نے پے بہ پے اتنے سوالات کر ڈالے تھے اور کچھ اس لہجہ میں کہ احمد بھی اپنے دل میں ایک آگ بھڑکتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا اور اس نے بدورا کا ہاتھ چوم کر کہا "بدورا ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔ میں اگر کسی کو چاہنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں تو وہ تم ہو۔ یہ اور بات ہے کہ میرے معتقدات میں فرق آگیا ہے۔ میں محبت کو انسان کی تباہی کا ایک بہانہ سمجھنے لگا ہوں۔ میں اب محبت کو یکسر لذت و انبساط نہیں سمجھتا۔ میری ساری ہستی جھلس گئی ہے۔ میں خاکستر ہو چکا ہوں اور یہ سب اسی ایک محبت کی بدولت۔ اس لئے اگر میرے اندر وہ ولولہ وہ اُمنگ نہیں تو جائے تعجب نہیں۔ لیکن میں تم کو چاہتا ہوں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ باوجود اپنی ہزار کوشش کے تم سے بے نیاز و بیگانہ نہ ہو سکا۔ تم مجھ سے کنارہ کش ہو کر بھی میری روح کی ملکہ بنی رہی ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اس درمیان میں لہو کے آنسو اس طرح بہا چکا ہوں کہ اب نہ دل میں وہ طاقت ہے نہ جگر میں وہ حال۔ لیکن بدورا میری طرف سے اس بدگمانی کو نہ راہ دو کہ میں تم کو چاہتا نہیں۔ نہیں بدورا میں تم کو چاہتا ہوں۔ مگر میری اپنی زندگی اس درجہ تلخ ہو چکی ہے کہ میں اب نہ اپنی زندگی کو پر کیف بنا سکتا ہوں نہ کسی دوسرے کی۔ ایسی صورت میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی کا مجھ سے امیدیں وابستہ کرنا کہاں تک درست ہے"۔

بدورا یہ سنکر بے قابو ہو گئی اور زار زار رونے لگی۔ ادھر کچھ دنوں سے اس کی یہی حالت تھی کہ دل کو ذرا سی ٹھیس لگی اور آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ احمد کی روح تڑپ گئی۔ اُس نے بدورا کے گرم گرم آنسو پونچھتے ہوئے کہا "یہ نہ کرو! بدورا یہ نہ کرو۔ میں تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ رونا بڑی چیز ہے۔ اسی نے مجھکو جلا ڈالا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں جینے سے مایوس ہو کر ہر وقت سانسیں گنتا رہتا ہوں۔ بدورا میں تمہاری محبت کرتا ہوں، قسم کھانے کی حاجت نہیں۔ کیا تم کو میری نگاہوں میں میری گفتگو کے ایک ایک حرف میں محبت کی علامت نہیں ملتی۔ آج اگر تمہاری چاہت میرے دل میں گھر نہ کر چکی ہوتی تو مالتی کے ساتھ ایسی بیدلی کا برتاؤ کر کے اس کو کھو نہ دیتا۔ کہو اب اور کیا چاہتی ہو؟"

بدورا نے کچھ نہ کہا۔ اس کی تسکین ہو گئی تھی۔ وہ یوں بھی جانتی تھی کہ احمد اس کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔ احمد نے اب اقرار بھی کر لیا تھا۔ اس نے اس موضوع پر زیادہ واضح گفتگو کرنا بے محل سمجھا۔ جب وقت آئیگا تو دیکھا جائیگا۔ اس خیال سے وہ خاموش رہی۔

احمد واقعی مالتی کو کھو چکا تھا۔ وہ بدورا کے مقابلہ میں اپنے سست ارادہ پر قائم نہ رہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بدورا طلاق پانے کے بعد اسی کی پناہ میں آئیگی اور اس سے یہ نہ ہو سکتا تھا کہ اس کو پناہ میں لینے سے انکار کر دے۔ مجبوراً مالتی کے خیال کو

دل سے نکال رہا تھا۔ اس کو اگر کوئی سکون تھا تو یہ تھا کہ اُس نے اپنا تمام سرمایہ مالتی کو دیدیا ہے اور وہ کسی کی دست نگر نہیں رہیگی احمد نے اپنے کو آنے والے واقعات کے حوالہ کر دیا تھا۔ جو کچھ ہونے والا ہوگا وہ ہو رہیگا اور وہ جس طرح اب تک اتفاقاتِ زمانہ کے ہاتھوں مجبور رہا ہے اب بھی ہے۔ (باقی آئندہ)

مجنوں گورکھپوری


## اردو کے دواوین

دیوان میر حسن صاحب بدر منیر قیمت ........ ۶ر

انتخاب کلیات ظفر۔ کلیات ظفر بہترین انتخاب ۸ر

کلیات نظیر اکبر آبادی۔ نہایت عمدہ و صحیح عہ ر

کلیات صفدر۔ یعنی کلام صفدر قیمت ..... عہ ر

دیوان داغ۔ مشہور و معروف کلام ...... عہ ر

گلزار داغ۔ داغ مرحوم کا کلام ...... عہ ر

کلیات اسمٰعیل مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا نہایت عمدہ اور اعلیٰ کلام ہے قیمت ........... عا ر

مراۃ الغیب۔ یعنی منشی امیر احمد صاحب کا کلام عہ ر

کلیات رعب۔ نہایت اعلیٰ کلام ہے قیمت عا ر

صنمخانۂ عشق۔ منشی امیر احمد صاحب مینائی کا دوسرا دیوان عا ر

چمن بینظیر۔ مختلف شعرا کا کلام ۱۲ر

ثمرۂ فصاحت یعنی جناب فصاحت لکھنوی کا وہ کلام جو انکا مایۂ ناز ہے عا ر

دیوان سخن۔ یعنی کلام خواجہ فخر الدین دہلوی کاغذ گندہ قیمت عہ ر۔ کاغذ سپید قیمت ........ ۱۲؍ ر

گلدستہ حفیظ اللہ خان۔ اس میں متفرق شعرا کا کلام درج ہے قیمت ........... عہ ر

ذو لسانین مجمع البحرین۔ از میر مظفر علی صاحب اسیر لکھنوی قیمت ........... عہ ر

## کتب عجائبات دنیا اردو

عجائب المخلوقات وسیع دنیا کی بیشمار عجیب و غریب چیزیں جن کو دیکھکر اور سنکر آدمی نقش بدیوار حیران ہو جاتا ہے اور جسمیں معلومات کا ایک بیشبہا ذخیرہ موجود ہے باتصویر رنگیں قیمت ۷؍ باتصویر بلا رنگ قیمت ........... للعہ ر

ایضاً فارسی باتصویر حسب قیمت بالا للعہ ر

معلم السیاست۔ ترجمہ پولیٹکل اکانمی عا ر

مطلع العجائب۔ باتصویرات رنگیں اس میں بھی عجائبات عالم کا ذکر ہے قیمت ........... عا ر

مطلع العلوم و مجمع الفنون۔ تمام علوم و فنون کا نہایت وضاحت اور عمدگی سے ذکر کیا گیا ہے قیمت ........... ے ر

عقل و شعور۔ ایک افسانہ کے پیرایہ میں تمام علوم کا نہایت اعلیٰ طریقہ سے ذکر کر دیا ہے اس کو پڑھکر ایک مبتدی کم و بیش تمام علوم میں کچھ نہ کچھ دسترس حاصل کر سکتا ہے قیمت ........... عا ر

کارخانۂ عالم صنعت و حرفت کے متعلق نہایت لاجواب اور بہترین کتاب ہے جسمیں مختلف صنعتوں پر بحث کی گئی ہے۔ عہ

ملنے کا پتہ

منیجر نگار پریس نظیر آباد لکھنؤ

# شاہان بہمنیہ

(بسلسلۂ ماسبق)

**مجاہد شاہ بہمنی**

محمد شاہ کے بعد اُس کا بیٹا مجاہد شاہ بہمنی انیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، یہ ملک سیف الدین غوری کا نواسہ تھا، اور نہایت ہی تنومند اور قوی ہیکل، تخت نشینی چند ہی روز بعد راجہ بیجا نگر کو لکھا کہ رودِ کرشنا اور تنگ بھدرا کے بعض حصص جو آپس میں مشترک ہیں ہمیشہ مابہ النزاع رہتے ہیں تم دریائے تنگبھدرا کو حد مقرر کر لو اور قلعہ بنکاپور وغیرہ ہمارے حوالے کردو۔

تنکاپور چونکہ بیجانگر اور سمندر کے درمیان میں واقع تھا اگر یہ قلعہ مسلمانوں کے ہاتھ میں آجاتا تو ہندوں کی تجارت کو سخت صدمہ پہونچتا اور وہ مسلمانوں کے قابو میں آجاتی اس لئے رائے بیجانگر نے بجائے ان قلعوں کو دینے کے مطالبہ کیا کہ محمد شاہ نے جو جو علاقے چھین لئے ہیں وہ واپس کردو اور دریائے کرشنا کو حد مقرر کرلو" یہ جواب سنکر مجاہد شاہ آپے سے باہر ہو گیا اور دولت آباد و بیدر سے لشکر بلوا کر اعلان جنگ کر دیا، اپنے نانا سیف الدین غوری کو گلبرگہ میں چھوڑ کر کثیر لشکر اور پانچسو کوہ پیکر ہاتھی لیکر دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کو عبور کر کے ادھونی پہونچا مگر یہاں اطلاع ملی کہ رائے بیجانگر گنگاوتی میں ہے تو صفدر خاں سیستانی کو بڑی لشکر دیکر گنگاوتی روانہ کر دیا اور امیر الامراء بہادر خاں اور اعظم ہمایوں کو ایک لشکر دیکر بیجانگر روانہ کر دیا اور خود آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔

راستہ میں اطلاع ملی کہ ایک آدم خوار شیر نے اطراف واکناف میں پریشانی پھیلا دی ہے چونکہ مجاہد شاہ نہایت ہی دلیر اور شکار کا حد درجہ شایق تھا اس لئے فوراً شیر کے شکار کے لئے تیار ہو گیا اور صرف سات پیادے ہمراہ لیکر جنگل میں گھس پڑا اور تیر سے شیر کو ہلاک کیا، ہندوں نے اس شگون کو اپنے لئے فال بد تصور کیا اور مسلمانوں کی فتح و نصرت کی پیشین گوئی سمجھ لیا، ادھر رائے بیجانگر مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا مگر شیر کے شکار کے شگون نے اسے ٹھرنے نہ دیا اور وہ سنڈور کے جنگلوں میں جا چھپا، مجاہد شاہ نے بھی تعاقب کیا مگر راجہ بندر رامیشور کی طرف فرار ہو گیا، چھ مہینے تک راجہ بھاگتا پھرا اور مجاہد شاہ تعاقب کرتا رہا اس بے تکے تعاقب کی وجہ سے لشکر تباہ ہونے لگا، راجہ بیمار ہو کر خفیہ راستہ سے بیجانگر پہونچ گیا، اور مجاہد شاہ نے تھوڑی سی فوج راجہ کے تعاقب کے لئے چھوڑ کر، بہادر خاں اور پانچ ہزار سواروں کو ساتھ لیکر بندر رامیشور کا رخ کیا مگر تھوڑی دور تک جا کر ایک نئے راستے سے بیجانگر کی طرف واپس ہوا راستہ میں ایک جھیل تھی جہاں سری رنگ نامی ایک بڑا مندر بھی تھا جسے توڑ تاڑ کر مسمار کر دیا اور مندر کے بیشمار جواہر لوٹ لئے گئے، مندر کے لٹنے اور مسمار ہونے کی کیفیت سنکر برہمنوں نے راجہ پر لعنت و ملامت کی بوچھار کر دی اور وہ ایک عظیم الشان لشکر لیکر مقابلہ کے لئے نکلا۔

جس وقت راجہ کا لشکر پہونچا مجاہد شاہ وہیں جھیل پر کھڑا ہوا تھا دشمن کی فوج نظر آئی تو چتر اوتار ڈالا اور محمود نامی افغان

سلحدار کو ساتھ لیکر ہندوؤں کی نقل و حرکت دیکھتا ہوا آگے بڑھا' ایک ہندو سپاہی نے مجاہد شاہ کے گھوڑے (شبرنگ) کو پہچان کر ایک پہاڑی کی آڑ سے پیچھے آکر وار کر دیا' اتفاقاً مجاہد شاہ کی نظر اُس پر پڑ گئی اور محمود افغان کو اشارہ کیا محمود نے ہندو سپاہی پر حملہ کر دیا مگر اتفاق سے اُس کے گھوڑے نے ٹھوکر لی اور محمود چت گرا اس کو گرتے دیکھکر ہندو سپاہی نے ایک بھرپور ہاتھ چھوڑ دیا۔ مگر خود کی وجہ سے محمود محفوظ رہا اور مجاہد شاہ نے ایک ہی وار میں ہندو سپاہی کے دو ٹکڑے کر دیئے ۱۳۷۵ء میں اسی زمانہ میں رائے بیجانگر اپنی فوج کو لئے ہوئے جھیل کو عبور کر رہا تھا کہ بادشاہ نے جنگ کا حکم دیدیا اور فوراً حملہ کر دیا امیر الامرا میمنہ پر اعظم خاں میسرہ پر تھے مقرب خاں اپنا آتش خانہ لئے ہوئے الگ تھا' شاہی فوج نہایت ہی جی داری سے لڑ رہی تھی اور ہندو لشکر مغلوب ہو رہا تھا کہ رائے بیجانگر کا بھائی مدّیا آٹھ ہزار سوار اور چھ لاکھ پیدل لیکر مدد کیلئے پہونچ گیا' اس کمک سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور وہ چمک چمک کر لڑنے لگے' روزانہ ایک آدھ جھڑپ ہونے لگی جس میں عموماً بادشاہی لشکر کو دبنا پڑتا تھا بے شمار فوج کام آگئی اور مقرب خاں شہید ہو گیا۔ ایک روز مقابلہ نے طول کھینچا اور نقشہ بدلنے لگا مجاہد شاہ نے اپنے چچا داؤد خاں کو سودرہ کی حفاظت کے لئے سات ہزار فوج دیکر مقرر کر دیا تھا' اس سے لشکر کی تباہی دیکھی نہ گئی درہ چھوڑ کر دوڑتا ہوا میدان میں پہونچ گیا اور اپنی سات ہزار فوج لیکر اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ ہندوؤں کے چھکے چھڑا دئے اس جنگ میں اس کے تین گھوڑے کام آئے اور وہ پیدل لڑتا رہا اور محض اسی کی وجہ سے فتح نصیب ہوئی، بادشاہ نے داؤد خان کو میدان میں دیکھکر اس وقت تو خاموشی اختیار کی مگر جب لڑائی ختم ہو گئی تو بڑا اوپر آکر بہت خفا ہوا کہ تم نے بہت بری حرکت کی اگر ہندو درہ پر قابض ہو جاتے تو ایک مسلمان بھی زندہ بچکر نہ نکل سکتا تھا۔ اور اسی وقت چند امراء کو دہانہ کی حفاظت کے لئے روانہ کیا مگر اسپر ہندو قابض ہو چکے تھے' واقعی یہ درہ تھا بھی نہایت خطرناک اگر پہاڑی کی آڑ پکڑ کر درہ کو روک دیا جائے تو غنیم کے نکلنے کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہتا تھا اور یہی وجہ مجاہد شاہ کے خفا ہونے کی تھی جب ہندوؤں کے قابض ہونے کی اطلاع ملی تو وہ خود درہ تک یلغار کرتا جا پہونچا' اسکو آتا ہوا دیکھ کر ہندو فرار ہو گئے۔ مجاہد شاہ نے خود درہ پر ٹھہر کر تمام لشکر کو وہاں سے نکال دیا۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ بیجانگر کو فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس نے ستر ہزار اسیرانِ جنگ کو جنمیں عورتیں اور بچے بھی تھے ساتھ لیکر ادہونی کا رُخ کیا' وہاں شاہی فوج محاصرہ کئے پڑی تھی خود بھی جا کر شریک ہو گیا نو مہینے محاصرہ قائم رکھا گرما کا آغاز تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ محصورین پانی کی قلت کی وجہ سے خود کو حوالے کر دینگے مگر اتفاق سے غیر معمولی بارش بھی ہو گئی اور شاہی لشکر میں وبا بھی پھیلی ملک سیف الدین کو اطلاع ملی تو خود آیا اور مجاہد شاہ کو سمجھایا کہ یہ معمولی قلعہ نہیں ہے جو اتنی جلدی فتح ہو جائے پہلے اطراف کے قلعہ بندر گوآ، بلگاؤں، بنکاپور وغیرہ فتح کر لیجئے پھر اس قلعہ کو فتح کر لینا آسان ہے، مجاہد شاہ واپس ہوا اور تنگ بھدرا کو عبور کر کے مدگل پہونچا اور لشکر کو مدگل ہی میں چھوڑ کر شکار کرتا ہوا راچور پہونچ گیا، صفدر خاں، اعظم ہمایوں، بادشاہ کی اس لاپرواہی سے ڈر رہے تھے، داؤد خاں دشنام دہی کا بدلہ لینے تلا ہوا تھا، جب بادشاہ شکار سے واپس ہوا تو صفدر خان اور اعظم ہمایوں کو برار اور دولت آباد کو واپس

کردیا اور خود وہیں رہ پڑا۔ داؤد خاں نے مسعود خاں وغیرہ کو ملا کر بادشاہ کے قتل کی فکر شروع کی اتفاق سے مجاہد شاہ نے مدگل سے نکلکر کرشنا کو عبور کیا اور مچھلی کے شکار کے لئے ٹھہر گیا انہیں دنوں میں آشوب چشم میں بھی مبتلا ہو گیا جس کی وجہ سے مجبوراً سفر ملتوی کرنا پڑا۔

ایک روز رات میں بادشاہ آرام کر رہا تھا کہ داؤد خان اور مسعود خان پہرے کے بہانہ سے سراپردے کے پاس بیٹھ گیا اور دو پہر رات کو خان محمد اور چند دوسرے آدمیوں کو باہر ٹھہرا کر اندر چلے گئے۔ ایک خواجہ سرا اور ایک حبشی غلام بادشاہ کے پاؤں دبا رہے تھے دونوں نے داؤد خاں کو برہنہ خنجر لئے ہوئے دیکھکر شور مچایا اور بادشاہ جاگ اٹھا۔ اور دیر تک آنکھیں ملتا رہا مگر آشوب کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا داؤد خان نے خواجہ سرا کے پیٹ میں خنجر بھونک دیا اور غریب کی آنتیں نکل پڑیں، بادشاہ نے باوجود آشوب کے داؤد خاں کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا، حبشی غلام کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا مگر وہ بھی مسعود خاں سے لپٹ پڑا مگر اس نے تلوار سے اس کا خاتمہ کر دیا اور بادشاہ کے سر پر ایسی شدید ضرب لگائی کہ فوراً کام تمام ہو گیا۔ شب جمعہ ۱۷ ذی الحجہ ۷۷۹ھ کو مجاہد شاہ نے ۲۲ برس کی عمر میں ۳ سال حکومت کر کے جام شہادت نوش کیا اور گلبرگہ میں مدفون ہوا۔

مجاہد شہ آں دائی تاج و تخت ... چو از دار دنیا بہ جنت رسید
زسرور بتاریخ او شد ندا ... کہ اہل العطا بادشاہ شہید

مجاہد شاہ بڑا قوی ہیکل، خوش رو، سڈول، جوان تھا اور بڑا بہادر اور جری تھا، ترکی زبان خوب جانتا تھا ہمیشہ ترکی اور فارسی زبان دانوں سے صحبت رہتی تھی، شمشیر، نیزہ، خنجر، تیر کمان، کا بے انتہا شوق تھا ایک دفعہ اپنے باپ کے خزانہ کو توڑ کر اشرفیوں کی چند تھیلیاں نکال کر دوستوں میں تقسیم کر دیں جب محمود شاہ کو اطلاع ملی اُس نے مبارک تنبول دار خاصہ کو بھیج کر بلوایا اور خوب کوڑے لگوائے، مجاہد شاہ نے پٹ پٹا کر ماں سے شکایت کی کہ اگر تنبو دار مجھ سے بادشاہ کے غصہ کا حال کہدیتا تو میں تم سے سفارش کراتا اور غصہ فرد ہونے کے بعد سامنے جاتا مگر اس نے اطلاع نہیں دی، ماں نے کہا اُسے کیا معلوم تھا کہ تم کو اس طرح کوڑے لگائے جائیں گے اور پھر وہ حکم سے مجبور تھا، مجاہد شاہ نے چند روز تک خاموشی اختیار کی اور پھر مبارک سے میل جول بڑھا لیا اور ایک دن مبارک سے کہا کہ میں سنتا ہوں کہ تم پہلوان ہو اور خوب کشتی لڑتے ہو ذرا ہمیں بھی زور دو، مبارک کو کیا خبر تھی کہ شہزادے کا خیال کچھ اور ہے۔ مبارک نے اس خیال سے کہ شہزادہ چودہ سالہ لڑکا ہے اور میں تیس برس کا جوان ہوں کشتی بدلی اور زور شروع ہوئی مگر شہزادے نے مبارک کو اٹھا کر ایسا پٹخا کہ بیچارے کی گردن ٹوٹ گئی اور فوراً ہی رخصت ہو گیا۔

مجاہد شاہ کو علماء و فضلاء سے خاص انس تھا ابتداء سے ایسے ہی لوگوں کی صحبت ملی تھی، اخلاق و عادات بھی نہایت ہی پسندیدہ اور عمدہ تھے

افسوس ہے کہ مجاہد شاہ کو زیادہ موقع نظم و نسق کی درستی کا نہیں ملا، اپنی مختصر سی مدت سلطنت میں وہ لڑتا ہی رہا مگر نہ تو کسی علاقہ پر قبضہ کیا اور نہ کوئی بڑی فتح حاصل کی۔ (باقی آئندہ)

تمکین کاظمی

# باب المراسلۃ والمناظرۃ

(از دار العلوم ندوۃ العلماء)

والا جناب، سلام و نیاز

اگست کا نگار دیکھا، فلسفۂ مذہب، اور "بعض سیاسی مسائل پر" آپ کے افکار عالیہ سے مستفید ہوا چاہتا ہوں کہ اس موضوع کے متعلق میں بھی کچھ عرض کروں

گزشتہ سال انجمن الاصلاح کے ایک کام سے ندوہ کے چند احباب کے ساتھ مجھے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تھا، اس وقت بھی میں نے مذہبیات پر آپ کی فکر بدیع سے فائدہ حاصل کیا تھا، آج کی صحبت بھی کچھ اسی قسم کا استفادہ مقصود ہے۔

مجھے جب آپ سے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقعہ ملا، میں ہمیشہ آپ کے لطف و عنایت کا شکرگزار رہا، کہ آپ نے بایں عدیم الفرصتی و کثرت کار ایک غیر معروف، اور ناقابل التفات دل و دماغ والے شخص سے گھنٹوں سلسلۂ کلام جاری رکھا، اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اس فکر بدیع اور وجدان جمیل کے متعلق کچھ عرض کروں، "مذہب پر، ارکان مذہب" پر "آئین مذہب پر، نوامیس مذہب پر" آپ نے جب گفتگو فرمائی، تو موجودہ طرق مذہبی کو ناقابل عمل، عقائد مذہبی کو یکسر ناقابل التفات، بتلایا، آپ نے ایک فلسفی کی حیثیت سے ان چیزوں کا تجزیہ فرمایا، اس کے بعد خندہ ازایا، آپ نے نماز کو خلاف تہذیب، بتلایا "جف القلم" پر تمسخر فرمایا، داڑھی کو منہ بگاڑنے سے تعبیر فرمایا، اور اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ پردہ کے متعلق جن خیالات کا اظہار آپ نے نگار میں فرمایا، اس سے کہیں حریت لئے ہوئے خیالات کا اظہار آپ نے پرائیوٹ طور سے فرمایا، یعنی آپ نے فرمایا، اصول حفظان صحت کے خیال سے اخلاقی نقطۂ نظر سے پردہ ایک لغو اور مہمل چیز ہے، میں نے اسپر اظہار حیرت کیا، اور اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی جو اس سے وقوع میں آنے والا تھا، میں نے عرض کیا تھا کہ مرد و عورت کے اتصال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں بھی لذ الزنا یورپ سے زیادہ پائے جائینگے۔ مرد کے جذبات میں التہاب ہوگا عورت اپنے جذبات کی پذیرائی چاہیگی، مرد خدع و فریب سے کام لیکر عورت کو دام تزویر میں پھانسے گا عورت کہ اس کی زندگی عبارت ہے محبت سے اس کے جال کا شکار ہو جائیگی، مرد اپنی رعنائی و زیبائی سے عورت کو مسحور کریگا عورت اُس کی ہو رہیگی، اس کے بعد مرد اپنی خلقی اور جبلی عادت کے

مطابق اسے سیہ کاری کے لئے چھوڑ دیگا، وہ بے بس ہوکر وہ کریگی جو آج "ہائڈ پارک" میں علی الاعلان ہورہا ہے" اسپر آپ نے فرمایا کہ یہ چیزیں عارضی ہونگی، اور چند نسلوں کے بعد اس قسم کی بدکرداریوں کا خاتمہ ہوجائیگا، اس لئے کہ بدکرداری سے طبیعت سیر ہوجائیگی، میں اس فلسفۂ جدیدہ پر متحیر ضرور ہوا، لیکن اس کے بعد میں بھی خاموش ہورہا اور جناب نے بھی سکوت اختیار فرمایا۔ ارشاد ہو کہ خلوت وجلوت میں اس قدر بعد عظیم کیوں ہے؟ اگر حقیقی خیالات آپ کے وہ ہیں جن کا میں اوپر اعادہ کرچکا ہوں تو پھر نگار میں اس قدر نرمی سے خالص شرعی حیثیت سے آپ نے روشنی کیوں ڈالی، اخلاقی جرأت کا فقدان آپ میں میرے لئے باعث حیرت ہے میں تو سمجھتا تھا کہ رسوائی اور بدنامی آپ کے لغت میں نہیں ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ احسان نہ ہوا"

صائب الرائے، انسان رسوائی خلق کی کب پرواہ کرتا ہے، اس کا جو عقیدہ ہے وہ منظر عام پر نمودار ہوکر رہتا ہے، خلق کی چہ میگوئیاں اس کے عزم وارادہ کے لئے خس وخاشاک کی حیثیت بھی نہیں رکھتیں، پھر آپ کیوں مرعوب ہوگئے، آپ نے اپنے ان افکار نادرہ اور تحقیقات جدیدہ کو پبلک میں کیوں نہیں پیش فرمایا، اگر سر سید احمد خاں اپنے عقائد پبلک میں پیش کرسکتے تھے، اگر مسٹر ظریف اپنے تخیلات سے پبلک کو واقف کرسکتے تھے، اگر مسٹر عبد الماجد (اب مولینا) اپنی فلسفیانہ موشگافیوں کو منصۂ شہود پر جلوہ گر کرسکتے تھے تو آپ کو کیوں تامل ہے؟ اب تو وہ زمانہ ہے کہ

انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

پھر آپ اپنے ان عقائد وخیالات کی تبلیغ وتلقین پرائیوٹ مجلسوں سے گزر کر محفل عام میں کیوں نہیں کرتے؟

دوسری بات جسپر میں آپ کی توجہ منعطف کرنے کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ سیاسی مسائل کے سلسلہ میں آپ نے خلافت اور مسلم لیگ کو بیکار بتایا ہے۔ جب شریف حسین حالت احتضار میں تھا، اور ہماری سرکار ابد قرار اس کی ساعی تھی کہ ہندوستان سے حجاج حج کرنے نہ جانے پائیں۔ اور بعض شریفی اس کی تائید بھی کررہے تھے، اس وقت خلافت ہی کا تو وہ ضعیف العمر مگر جوان ہمت قائد تھا جسنے حج کا راستہ صاف کرایا، اور گورنمنٹ کو بتلا دیا کہ مسلمان مذہبی مراسم کے آگے کبھی بھی برطانیہ کی ہوا وہوس کے آگے سر نہیں جھکا سکتے، جامعہ ملیہ جیسی فقید المثال درسگاہ بھی اپنے وجود میں خلافت ہی کی رہین منت تو ہے، اور سب سے

بڑھکر یہ خلافت ہی نے تو اس طلسم سامری کو توڑا، آج آپ مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دے رہے ہیں، لیکن خلافت ہی تو ہے جسنے مسلمانوں میں صحیح جذبۂ حریت پیدا کیا، خلافت ہی تو ہے جو آج مدارس شبینہ، (نائٹ اسکول) اپنی حسب استطاعت قایم کر رہی ہے۔ پس بصد عجز و نیاز عرض ہے کہ ان واقعات ومشاہدات کے ہوتے ہوئے بھی خلافت کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہے ؟ کیا مسلمانوں میں آپ صرف وطینت پیدا کرانا چاہتے ہیں۔ جب وطن لائق صد ستائش و مرحبا جذبہ ہے لیکن وطینت وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں، تہذیب کے آذر نے جو نو بنو اصنام ترشوائے ہیں ان میں سب سے بڑا بت وطن ہے۔

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

آپ فرماتے ہیں اگر وطینت پیدا ہو جائے تو ہندوستان آزاد ہے، میں عرض کرتا ہوں اگر وطینت پیدا ہو جائے، تو برطانیہ کو اس "ہوے" سے نجات ملجائے جو "پین اسلام ازم" کے نام سے اسپر مسلط ہے، اور پھر جی کھول کر وہ اپنے دندان حرص و آز صرف ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی پر تیز کرے، ترکوں نے یورپ کی استعماریت کا مقابلہ کیا، اس کی قیصریت کا مقابلہ کیا، اس کے استبداد و تشدد کا مقابلہ کیا لیکن اس کی تہذیب و تمدن سے مرعوب ہو گئے، وہ بلا ارادہ چوتھائی صدی کے بعد یورپ کے آگے اپنا سر نیاز جھکا دیں گے، یورپ کی سب سے خطرناک چیز تو یہی ہے، کہ وہ "بھس" میں چنگاری ڈالدیتا ہے اور "جمالو" بنکر تماشہ دیکھتا ہے، یہ جذبہ اگر فنا ہو گیا تو مسلمان کہاں رہے، ؟ آپ کی سمع خراشی کے خیال سے ان اشارات پر اکتفا کرتا ہوں، جو میرا مافی الضمیر سمجھانے میں آپکو مدد دیں گے، ورنہ تفصیل سے اپنے ناچیز خیالات آپ کی خدمت میں پیش کرتا، مجھے امید ہے کہ آپ میرے ان معروضات کا جواب ضرور عنایت فرمائیں گے، خواہ نگار میں، خواہ پرائیوٹ طور سے خود مجھے۔

رئیس احمد جعفری

---

(نگار) آپ نے غضب کیا کہ خلوت کی ملاقاتوں کا ذکر یوں آزادی و بیباکی سے کر دیا اور پھر لطف یہ کہ آپ مجھ سے اُسکی اشاعت بھی چاہتے ہیں۔

نازم بہ خواری کہ بہ زمین میاں رسد

غالب ایک جگہ سکوت و تکلم کے عاشقانہ فلسفہ کو اس طرح بیان کرتا ہے ؎

چو لب زہر زہ نوایاں شوق نتواں شد
چو شمع خلوتیاں جانگداز باید بود

لیکن آپ نے نتواں شد کو اختیار کرنا پسند کیا اور باید بود کو ناقابل عمل سمجھکر نظر انداز کر دیا۔ خیر،

گر ہمیں ست رضایت بہ لبم مہر خوش ست

مگر میں آپ کے خوش کرنے کے لئے اس تمہید کو زیادہ طویل نہیں بنانا چاہتا، کیونکہ جو کچھ آپ نے حد درجہ سنجیدگی و متانت کے ساتھ لکھا ہے اس کے جواب میں آپ کے چھیڑنے کو تو ضرور جی چاہتا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ الزام میرے سر آجائے اور آپ ہمیشہ کے لئے غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔

آپ نے اپنی تحریر میں تین باتوں کا مطالبہ مجھ سے کیا ہے ایک یہ کہ پردہ کے متعلق عبد الماجد صاحب دریابادی کے خلاف جو خیال میں نے ظاہر کیا ہے، وہ میری زبانی گفتگو (بلکہ میری پہلی تحریروں کے بھی) خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ فلسفۂ مذہب پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مینے بعض ایسی باتیں لکھیں جو میری گفتگو کے منافی تھیں اور تیسرے یہ کہ خلافت کمیٹی کے تحلیل ہو جانے کی میں نے کیوں رائے دی جب کہ اس کی اہمیت مسلم ہے اور کانگرس کی شرکت کو کیوں ضروری قرار دیا جبکہ وہ مسلمانوں کے درد کی دوا نہیں اور جذبۂ وطنیت، پان اسلامزم کی طرف سے یوروپ کو مطمئن کر دیگا

اب سلسلہ وار جواب ملاحظہ ہو:۔

(۱) پردہ کے متعلق جو کچھ میں نے آپ سے زبانی گفتگو کی یا اس سے قبل تحریر کے ذریعہ سے اظہار خیال کیا وہ ہنوز اپنی جگہ اسی حال پر قایم ہے اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو پردہ کا حامی نہیں بنا سکتا۔ میرا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ عبد الماجد صاحب دریابادی جو استدلال چہرہ کو داخل ستر نہ کرنے کے لئے پیش کر رہے ہیں وہ غلط ہے اور یقیناً کلام مجید سے چہرہ کا چھپانا ثابت ہوتا ہے، لیکن آپ نے اس سے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں خود بھی پردہ کا حامی ہوں۔ میں نے انھیں کے نقطۂ نظر، انھیں کے اصول استدلال سے اُن کی غلطی کو ظاہر کیا تھا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ جب کلام مجید سے چہرہ کا چھپانا ضروری ثابت ہوتا ہے تو پھر میں کیونکر پردہ کی مخالفت کر سکتا ہوں۔ اسپر میں اس سے قبل کافی بحث کر چکا ہوں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میں تمام معاشری و تمدنی مسائل کو وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر سمجھتا ہوں، چنانچہ جولائی کے ملاحظات میں بھی اسکو ظاہر کر چکا ہوں۔ اس لئے اگر اُس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے منہ چھپانا ضروری تھا تو یہ لازم نہیں آتا کہ اب بھی اس پر عمل کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص عبد الماجد صاحب کی طرح اس کا قایل ہو کہ کلام مجید کے معاشری احکامات میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو پھر یہ بتائے کہ ان کے پاس کیا دلیل پردہ کو اٹھا دینے کی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ تعریض تھی جسے میں نے اگست کے ملاحظات میں عبد الماجد صاحب کے خلاف پیش کی لیکن بعض حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ میں خود پردہ کا حامی ہوں۔

(۲) فلسفۂ مذہب کے متعلق جو رائے میں نے قایم کی وہ بھی میری اس گفتگو کی منافی نہیں ہے جو آپ کے سامنے کبھی

ہیں نے کی تھی۔ میرا یہ ایمان ویقین ہے کہ جس دور سے اس وقت مسلمان گزر رہے ہیں وہ اُن کے انحطاط وزوال کا انتہائی دور ہے، کیونکہ دین ودنیا دونوں کے لحاظ سے ان کی ذہنیت اس قدر ذلیل وپست ہوگئی ہے کہ اس کا علاج سوائے اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ اصول مذہب اور اعتقادات کو اپنی جگہ رکھ کر تمام ان مسائل کو جن کا تعلق تمدن سے ہے یا جو تمدن پر موثر ہوتے ہیں بدلدیا جائے اگر بحالت موجودہ ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ میں نے اگر ارکان مذہب، آئین مذہب اور نوامیس مذہب پر آپ کے قول کے مطابق مضحکہ اڑایا تھا تو اس سے مقصود صرف موجودہ عہد کے مسلمانوں کا آئین اور موجودہ اسلام کے نوامیس وآئین تھے کہ اب ان میں سے کسی ایک کا بھی وہ مفہوم نہیں رہا جو واضع نے بتایا تھا۔

نماز سے مقصود صرف اُٹھنا بیٹھنا نہ تھا بلکہ ہئیت اجتماعی پیدا کرنا، رشتۂ اخوت وہمدردی کو استوار کرنا، باہم امداد وتعاون کے جذبات کو برانگیختہ کرنا تھا، لیکن آج چونکہ نماز سے یہ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا اس لئے یقیناً وہ قابل مضحکہ چیز قرار دیجائیگی اسپر اور تمام مسائل وارکان کا قیاس کر لیجئے۔ داڑہی کے متعلق بھی چونکہ تجربہ شاہد ہے کہ باندازۂ درازی اسکی معصیت پرپری بڑہتی جاتی ہے اس لئے یقیناً اب داڑہی رکھنا صرف صورت ہی بگاڑنا ہے۔

بہرحال میری رائے نہ صرف یہ ہے بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اصل چیز جسے توحید کہتے ہیں اس کے متعلق بھی مسلمانوں کا طرز عمل ایسا لغو وجہل ہے کہ اس کا علاج اب سوائے اس کے کوئی نہیں کہ ایک مرتبہ خدا ہی کے وجود سے انکار کردیا جائے تاکہ اُس کے بعد صحیح توحید کا اعتقاد از سر نو ان میں پیدا ہو۔ یقین ہے کہ آپ نے میرے اصل مدعا کو سمجھ لیا ہوگا۔

(۳) خلافت کمیٹی سے مجھے اس لئے اختلاف نہیں کہ مسلمانوں کو اپنی کوئی جماعت ایسی نہ بنانا چاہئے جو سیاسیات مذہبی کو ہاتھ میں لے، بلکہ مدعا یہ ہے کہ جب خلافت کا وجود باقی نہیں رہا جب دنیائے اسلام اس عفریت کے اندیشہ سے پاک ہوگئی تو پھر کیوں اس کو یہ نام قایم رکھ کر زندہ رکھا جاتا ہے۔ یہی میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی عرض کرتا ہوں۔ آپ نے جامعہ ملیہ کے قیام کو خلافت کمیٹی کا کارنامہ بتاکر اس کے وجود کی اہمیت کو ثابت کرنا چاہا ہے، حالانکہ جامعہ ملیہ کی موجودہ مالی حالت ایک بین ثبوت خلافت کمیٹی کی نااہلی اور بیچارگی کا ہے۔ جب خلافت کمیٹی باہمہ شور وغوغا اتنی ساکھ بھی نہ پیدا کرسکی کہ ایک مدرسہ اس سے چل جاتا تو اور کیا توقعات اس سے قایم ہوسکتی ہیں۔ بہرحال یہ داستان بہت دردناک ہے اور ممکن ہے اس سلسلہ میں بعض ایسی باتیں زبان پر آجائیں۔ جن کے اظہار کا ابھی وقت نہیں آیا ہے اس لئے مجھے مجبور نہ کیجئے کہ زیادہ شرح وبسط سے کام لوں۔ اب رہا یہ امر کہ کانگرس میں شریک ہونے سے مذہبیت کمزور ہوکر وطنیت پیدا ہوجائے گی اور اس طرح پان اسلامزم کے خطرہ سے یورپ آزاد ہوکر اور زیادہ مضرت رساں ثابت ہوگا ———

سو معاف فرمائیے اگر میں یہ کہوں کہ

درآں دیار کہ زادی ہنوز انجائی

اگر مذہبیت نام اسی تنگ نظری کا ہے جو تبلیغ وقربانی اذان اور باجہ کے مسایل میں ظاہر ہورہی ہے تو اس مذہبیت

کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے لیکن اگر اسلام نام ہے اس وسعت نظر کا، اس آغوش لطف و محبت کا جو تمام بنی نوع انسان کے لئے ہر وقت کھلی ہوئی ہے تو پھر سب سے پہلے اس کا اثر یہی ہونا چاہئے کہ ہم میں نہ صرف وطنیت بلکہ ارضیت پیدا ہو تا کہ ہم کرۂ ارض کے تمام باشندوں کو صحیح طور پر دعوت اسلام دے سکیں۔

پان اسلامزم کے باب میں آپ کے اطمینان و سکون کو دیکھ کر مجھے بہت لطف آیا۔ یورپ کب کا آپ کے پان اسلامزم کی حقیقت کو سمجھکر مطمئن ہو بیٹھا ہے اور آپ ابھی تک یہی خواب دیکھ رہے ہیں کہ اس مصنوعی چہرہ سے طفل یورپ خائف ہے

انچہ میگوئی ز لفظ بے حقیقت بیش نیست

## شبیہ نیاز

آن یار کہ بے نظیر و بے مانند است | عقل و دل و جاں بہ عشق او در بند است
در یک نظر از مقام عالی جاں را | بر خاک فشاند و جاں بداں خرسند است

(سلماں ساوجی)

میرے سامنے مارچ ۱۹۳۰ء کا نگار رکھا ہوا ہے اس میں مضامین کے علاوہ جو ایک بے بہا خزانہ ہیں حضرت نیاز کی سحر آفرین صورت بھی ہے، جسے دیکھکر نگار کے مطالعہ کرنے والے بالخصوص اور ارباب فہم و ادراک بالعموم قلب میں ایک خاص کیفیت متہیج پاتے ہیں، جریدۂ نگار کی ادبی تبلیغ، اسکا محققانہ طرز انشا، اسکا دلفریب اسلوب بیان، اور سب سے بڑھکر مذہبی اصول کی کاوشیں ارباب مطالعہ پر مدیر کی بالکل مختلف ذہنی صورت پیش کرتی تھیں شغل و فکر کی ہمہ گیری، اور منصبی ذمہ داریوں کی پابندیاں نگار کے مسلسل مطالعہ سے باز رکھتی تھیں، لیکن جب کبھی موقعہ ملتا، مماثلت ذوق، و یکرنگی جذبہ و احساس کی بنا پر نگار، یا جادو نگار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیتا، حضرت نیاز سے شرف نیاز کی تمنا تو ضرور تھی، لیکن فرصت کی قلت اور ایام کی ناساعدت کا گلہ کروں، یا جذبۂ لطیف کی نا استواری کا کہ آج تک محرومی رہی، نگار کے تخیلات اور اس کی علمی و ادبی اصلاحات ایسی نہ تھیں کہ ناظرین نگار میں مدیر کی ذاتی ملاقات کا جذبہ نہ پیدا کر دیں، خدا کا شکر کہ حضرت نیاز نے خود ہی ناظرین نگار کا یہ نصف شوق پورا کر دیا۔

میں نے اس شبیہ کو دیکھنے سے قبل جناب نیاز کی بالکل مختلف شکل ذہن میں قائم کی تھی۔ علمی خدمتیں، مطالعۂ کتب کی دیدہ ریزیاں دل و جگر پر جو اثر کرتی ہیں وہ مخفی نہیں، اس اعتبار سے جناب نیاز کو بالکل نحیف اور ضعیف الجثہ ہونا چاہئے تھا، لیکن اس کے برخلاف میں نے جب

تصویر دیکھی تو اسیطرح متاثر ہوا، جیسا چند سال قبل انگلستان کے مشہور فلسفی "ہیوم" کی شبیہ دیکھکر متاثر ہوا تھا۔ "ہیوم" کی شبیہ اس کی مشہور تصنیف "مبادی اخلاق" میں شایع ہوئی ہو کیفیات عشق و محبت کے اظہار کے لئے تغزل سے استدلال زیادہ موزوں ہو، اور اسلئے مجھے اپنے جذبۂ لطیف کی ترجمانی کے لئے فارسی شعرا میں حافظ، عرفی اور خسرو کی طرف دست انتخاب بڑھانا چاہئے تھا لیکن قدرتی طور پر میرا ہاتھ حضرت سلمان ساوجی کے قلمی نسخہ کلیات پر پڑا، جو نظرت کی رہنمونی میں، اور زمانہ کی انقلابی رفتار سے غلطاں پیچاں، لیکن اسی نفاست ظاہری اور اسی آب و تاب کے ساتھ میرے ہاتھوں لگ گیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ حضرت حافظ لسان الغیب تھے، تجارب انام ہے۔ انکار کی چنداں وجہ نہیں گو غیر مقلدانہ عقیدہ اس تسلیم کے منافی ہے۔ میں تو کہتا ہوں حضرت سلمان ساوجی بھی ایک باکمال بزرگ تھے، معلوم ہوتا ہے انھوں نے یہ رباعی میرے ہی لئے کہی تھی، رباعی میں مشہور تو زیادہ خیام، سعید ابن ابی الخیر، اور بابا طاہر عریاں ہیں، جنکی رباعیاں مغرب کی علمی مجالس نے مختلف طرق طبع سے شایع کیں۔ ہاں کہنا یہ تھا کہ رباعی تو مختص ہو، اخلاقی اصلاح، عبرت آموز تلقین، اور مواعظانہ شرر انگیزیوں سے لیکن معلوم ہوتا ہے، جناب سلمان نے اس میں تغزل کا رنگ غالباً اسی "لسان الغیب" کہلانے کے صلہ میں، پیدا کیا تھا، واقعۃً "شبیہ نیاز" پہلی نظر میں ایک طوفاں خیز تاثر پیدا کر دیتی ہے، اور انسان ان سحر آفرین نگاہوں میں جن میں "اکحل العینین" کا لطف پایا جاتا ہے، ایک خاص جاذبانہ عمل پاتا ہے،

میرے سامنے اس وقت علم قیافہ کی ایک مستند کتاب ہے، ہمارے وطن کی جلیل علم نواز مجلس کا یہ ایک عدیم النظیر کارنامہ ہے کہ اُس نے "جیین سدھانتہ بھاون" قایم کرکے علوم و معارف کی بے شمار نایاب کتابیں جمع کر دیں، علم قیافہ کا یہ انگریزی نسخہ اسی کتبخانہ کا فیضان ہے یہ کتاب جرمن کے مشہور "قیافہ شناس" علامہ جان کیسپر لاویٹر کی تصنیف ہے، پہلے یہ کتاب جرمنی زبان میں تھی، ایک انگلستانی عالم ٹامس ہالکروفٹ نے انگریزی زبان میں جرمنی زبان کے صحیح نسخوں سے ایک خلاصہ مرتب کیا۔ اس کے ابتدائی اوراق میں خود لاویٹر کی لکھی ہوئی ایک سند بھی ہے، جسمیں مصنف نے اقرار کیا ہے کہ یہ کتاب تلخیص صحیح، اور معتبر ہے۔

جناب نیاز کی شہر آشوب شبیہ نے لاویٹر کی کاوشوں کا بھی مجھے مرہون منت بنایا، مینے یہ شبیہ سامنے رکھکر قیافہ کی اس کتاب کا نہایت عرقریزی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ علامہ

موصوف کی تحقیقات متعلقہ وجہ، جبیں جبہ، عین، انف، لب وغیرہ شامل ہیں جدا جدا دیکھی۔ اس کتاب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ تشریحات کے لئے صورتیں بھی بنائی گئی ہیں، ان صورتوں سے مجھے اپنی کاوش میں بڑی مدد ملی، "شبیہ نیاز" کی طرح ایک مماثل صورت لکھکر لاویٹر نے اس کے متعلق فیاض، ارادہ کا راسخ، اور نیک دل لکھا ہے۔ اسی طرح کی دوسری شبیہ دیکر جس کی پیشانی جناب نیاز کی پیشانی سے بہت مماثل ہے، علامہ موصوف لکھتا ہے "ظرافت نواز" - گو مجھے اس آخری رائے کا پتہ نہ جناب نیاز کی شبیہ میں ملتا ہی نہ عمل میں لاویٹر نے اس کتاب میں "حسن صورت و خصائل باطنی" کے متعلق ایک باب لکھا ہے اور اس کے اندر ایک بڑی عالمانہ بحث کی ہے، گو علامہ موصوف "کراہت منظر اور عادت ناہموار" کے التزام کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن انھوں نے نوع انسانی کے اس کلیہ کو تسلیم کر لیا کہ "حسن صوری اور حسن معنوی" متلازم ہیں، مولا جامی اُن حضرت یوسف کے متعلق، جن کے حسن بے مثال یا جمال غریب النوع کے بارہ میں آپ قرآنی استشہاد نہیں پاتے، اپنی مشہور مثنوی "یوسف زلیخا" میں جسکا انگریزی ترجمہ نظم میں گریفتھ نے شایع کیا، لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| ولے خلقے ز ہر سو در تماشا | ہمی گفتند حاشا ثم حاشا |
| کہ ہیں روئے نکو بدکاری آید | وزیں دلدار دل آزاری آید |
| فرشتہ است ایں بصد پاکی سرشتہ | نیاید کار شیطان از فرشتہ |
| نکو رومی کشد از خوئے بد پائے | چہ خوش گفت آں نکو روئے نکو رائے |
| کہ ہر کیں در جہاں نیکوست و یش | بے بہتر ز روئے اوست خویش |

علامہ جامی کا یہ نظریہ، لاویٹر کے اصول قیافہ کے بالکل مطابق ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا جناب نیاز کی عقلی و علمی حیرت انگیزیوں کیساتھ، آپ کی صورت بھی حیرت انگیز ہے یا نہیں ایک عامی سے عامی بھی یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "شبیہ نیاز" کا یہ جدید الشیوع خاکہ اخلاقی اور نفسیاتی علوم تربیت کا جولانگاہ ہے۔ بشرہ سے تقدس، متانت و نیکی نمایاں طور پر ظاہر ہے، دہن خموش اور دیدہ حیراں میں جو لفظ پنہاں ہیں، اگر کسی کو جناب نیاز سے ذاتی کشیدگی نہ ہو تو بلا پرکیف بتائے نہیں رہ سکتیں ہیں تو اپنے محدود دائرہ معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں، کہ ممدوح " بے بہتر ز روئے اوست خویش " کے مصداق ہیں۔ نگار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ استاد معنوی جناب علامہ عبدالماجد صاحب (فلسفی) اکبر اور حضرت

سے کشیدگی ہے، خدا کرے یہ کشیدگی اختلافات فکرو احساس کی بنا پر ہو، ذاتی نہ ہو۔ عقائد اور ر انکار میں تمثل، بعض اوقات ناممکن ہو۔ جناب نیاز کا تحقیقاتی طوفان آپ کی پر جوش علمی کاوشیں، آپ کا غیر جانبدارانہ طرز استقرا، کیونکر ممکن تھا کہ فکر و عقیدہ میں تغیر اور تبدل نہ پیدا کرتا۔ واصل ابن عطا اور حضرت حسن بصری دونو امام جعفر صادق کے تلامیذ ارشد تھے ایک پر یونانی فلسفہ اور علمائے اسکندریہ کے نظریات نے گہرا اثر ڈالا، وہ مسلم رہا، اور ضرور رہا دنیا چاہے جو کچھ کہے، لیکن اس نے یونانی علم ومعرفت کے تاثر کے باوجود اسلام سے منہ نہیں موڑا" ——— "دوسرے پر منقولات کی تحصیل، حدیث نبوی کے شغف، اور ارباب عرفان کے جلیس وندم نے ایک دوسرا اثر ڈالا، ایک مذہبیت اعتزال کا پیشوا بنا، دوسرا اہل تسنن کا مقتدیٰ۔ یوں تو تکفیری فتاوے کس کے خلاف نہیں صادر ہوئے، امام فخر الدین رازی، جیسے علامہ اجل بھی اس تیر بلا کے ہدف ہو چکے ہیں، حال میں مجھے علامہ شیخ بہاؤ الدین احمد کی کتاب "کشکول" کا نہایت عمدہ قلمی نسخہ ملا، یہ کتاب عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئی تھی، ملک العلی احمد شہید عاملی اس کے مترجم ہیں، قلمی نسخہ فارسی بارہویں صدی کا لکھا ہوا ہے، اسمیں ایک نہایت عمدہ واقعہ حضرت ابو حنیفہ اور حضرت ابو العینا کی ملاقات کے متعلق ہے۔ ایک دن حضرت امام اعظمؒ ابو العینا کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، امام موصوف نے دریافت فرمایا کہ اے ابو العینا! حدیث شریف میں ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ بندہ کو اندھا کر دیتا ہے تو بینائی کے بدلے کوئی دوسری چیز اسے عطا کر دیتا ہے، فرمائیے آپ کو کیا چیز ملی، حضرت ابو العینا محدث تھے، اور جناب امام فقیہ محدثین اور فقہا کا مجادلہ اسلامی تاریخ کا معروف ترین واقعہ ہے، ابو العینا نے جواب دیا "آنچہ بمن کرامت کردہ است اینست کہ ترا و امثال ترا نمی بینم" جناب نیاز اور فلسفۂ نفس کے مشہور نباض (عبد الماجد صاحب) کی مثالیں بھی یہی ہوں تو مضائقہ نہیں، ایک واصل ہو دوسرا حسن، ایک نعمان ہے، دوسرا ابو العینا۔ فکر و عقیدہ کے تباین اور تخیل و احساس کے تضاد نے بہت سی ایسی صورتیں پیدا کر دی ہیں جو اس وقت ہمارے وطن کے قابل فخر ادیبوں میں متداول ہیں، یعنی نوک جھونک، بحث و تمحیص، رد و قدح لیکن خدا ذاتی اختلاف سے بچائے، خیر بہر کیف میں "شبیہ نیاز" کے متعلق اپنے تاثرات ظاہر کرنا چاہتا تھا، لیکن سلسلۂ سخن چھڑ گیا تو دل مجروح نے الجھن میں یہ نگار بھی دکھا دیا، خدا دو نو ارباب فکر کو ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے متاثر کرے

امید ہے کہ جناب نیاز بذریعہ نگار اپنے خیالات سے آگاہ فرمائینگے

عبدالمالک السیفی

(نگار) میں آپ کی اس تحریر کو شایع کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا اگر آپ اس سلسلہ میں بعض ایسی باتیں نہ لکھ جاتے جن کا جواب دینا ضروری ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مجھ میں اور عبدالماجد صاحب دریا بادی میں باہم کشیدگی ہے، حالانکہ کم از کم مجھے اپنے متعلق یہ یقین ہے کہ میں انکی ذات سے کوئی کشیدگی اپنے اندر نہیں پاتا اور نہ میرا مسلک ہے۔ ممکن ہے وہ مجھ سے برہم رہی ہوں یا اب ہوگئے ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے سامنے اُن کی کوئی خدمت ملک و قوم دین و علم ایسی موجود نہیں ہے جس کی بنا پر وہ مجھ سے مطالبہ سر عجز جھکا دینے کا کریں یا میرے او پر کوئی ایسی تعریف صرف فرمائیں جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے کو بہت بلند چیز سمجھتے ہیں۔ علم و فضل کا جہاں تک تعلق ہے میں وہ اور دنیا کا بڑے سے بڑا عالم فطرت کے مقابلہ میں طفل مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اس لئے میرے نزدیک سب سے بڑا جاننے والا وہی ہے جو اپنے نہ جاننے کا اعتراف کرے۔ اور بنا براں، اگر عبدالماجد صاحب یا کوئی اور مولوی منش یہ گمان کرے کہ وہ بڑا دانا اور صاحب بصیرت ہے تو کم از کم مجھ پر اس کا اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ بحمد اللہ میں بھی انھیں کی طرح ناقص دیدۂ بینا اور نامکمل گوش شنوا رکھتا ہوں۔

پھر چونکہ اس جذبۂ تفوق کا اظہار سب سے پہلے انھیں کی طرف سے ہوا تھا اور وہ بھی اس تیور و انداز سے گویا وہ میرے مقابلہ میں فلاطون و ارسطو کی حیثیت رکھتے ہیں حالانکہ اگر وہ فلاطون و ارسطو ہو جائیں تو بھی انسان ہیں اور انسان کا علم ہی کیا۔ اس لئے میں نے ان کو بتا دیا کہ دیکھو "بزم میں اہل نظر بھی نہ کہیں بیٹھے ہوں"

میں جناب عبدالماجد صاحب دریا بادی کو اچھا انشا پرداز اچھا نثر لکھنے والا سمجھتا ہوں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر وہ اپنی اس فطری ادبی اہلیت سے صحیح کام لیکر صرف ادب کی خدمت کرتے اور ادب میں بھی محض نثر (کیونکہ نظم کے باب میں انکی صحت ذوق کا قائل نہیں ہوں) اور سیاسیات و مذہبیات کو اپنے دماغ کا تختۂ مشق نہ بناتے جہاں الفاظ سے زیادہ قوت عمل اور حسن بیان سے زیادہ آزادیٔ خیال کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ غالباً مفید تر فرد ثابت ہوتے، لیکن چونکہ ان کو لیڈر بننا تھا، رہبر و مصلح کی شاندار زندگی انکا نصب العین تھا، مولانا کہلائے جانے کی لذت ان کو بیقرار کئے ہوئے تھی، خداوندان خانقاہ کی شاہانہ معاشرت دیکھ دیکھ کر اس کے حصول کا ولولہ ان کے دل میں پیدا ہو رہا تھا اسلئے انھوں نے "مسٹر و فلسفی" کی قربانی کو نہایت آسانی سے گوارا کر لیا اور چونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس "ذبح عظیم" کی جزا بھی حد درجہ "جزیل" ہونی چاہئے اس لئے انھوں نے بیک وقت سیاست و مذہب، علم و تصوف، تاریخ و ادب، سب پر قابض ہو کر

تو اسے قیادت بلند کرنا چاہا اور وہ اس میں اس حد تک کامیاب بھی ہوئے کہ ادھر خلافت کمیٹی کے صدر ہو گئے جمعیۃ العلما کے ممبر بنا دئے گئے "تصوف اسلام" لکھ ڈالی "پیام امن" دنیا کو سنا دیا، "زود پشیماں" ڈراما تصنیف فرما دیا، ادبی تنقیدیں کرنے لگے، قرآن و حدیث کا حوالہ دینے میں آزاد ہو گئے، قوالی سننا شروع کیا، مزاروں پر جانے لگے اور اسی کے ساتھ ابن سعود کے بھی طرفداری کی اور ہدم مقابر کا بھی فتویٰ دیا وغیرہ وغیرہ پھر ان مختلف جہات اور متضاد سمتوں میں دوڑنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ ہر گروہ و طبقہ میں شامل ہو جائیں۔ ہر جماعت و انجمن میں ان کی پرسش ہونے لگے، ممکن ہے کہ وہ اس مقصود میں اپنے نزدیک یا بعض کی نگاہوں میں کامیاب ہوئے ہوں، لیکن نظر حقیقت شناس سے یہ امر کبھی مخفی نہیں رہا کہ وہ کیا چیز بننے کے لئے پیدا ہوئے تھے، اور اس کو ترک کر دینے کے بعد وہ کچھ نہ رہے اور نہ کچھ بن سکے۔

میرے نزدیک انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ انسان بنے اور علم و مذہب کی بھی غایت یہی ہے لیکن اگر کسی کا فضل و کمال عُجب و غرور، برتری و تفوق کا جذبہ خلق کر کے دوسروں کی طرف سے جذبات تحقیر و خفت پیدا کرتا ہے تو سوائے اس کے کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ شدید جہل میں مبتلا ہے، رعونت کا عذاب اس پر مسلط ہے اور ابنائے جنس کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک شخص کے انسان ہونے کے متعلق سب سے پہلے اس کے اخلاق کو دیکھا جائے اس کی خانگی زندگی پر غور کیا جائے، لواحق و متعلقین، اعزہ و احباب کے ساتھ اس کے سلوک پر غور کیا جائے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے عبد الماجد صاحب کا ان تمام باتوں کے لحاظ سے پورا مطالعہ کیا ہے لیکن جہاں تک مجھے موقعہ ملا ہے اس کے بنا پر یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے بلند انسان نہیں ہیں۔ اور اگر میں اپنے متعلق انکسار سے کام لوں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ سے شاید کچھ ہی بہتر ہوں لیکن نہ اس قدر کہ وہ اپنے آپ کو "طبیب" سمجھیں اور مجھے "وکیل"

بہرحال میری جو رائے عبد الماجد صاحب کے متعلق ہے اس کو میں نے نہایت صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا کہ آئندہ آپ کو میرے اور ان کے متعلق اگر کشیدگی دبرہمی کا خیال پیدا ہو تو اس کا سر رشتہ اُس جگہ نہ ڈھونڈھیں، جہاں جہل کا مفہوم علم نہیں ہے بلکہ وہاں جہاں علم کو جہل کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

آپ نے میرے اور عبد الماجد صاحب کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے جن اکابر علم و فن کے نام بصورت تشبیہ گنوائے ہیں، وہ آپ سب کے سب انھیں کے لئے مخصوص کیجئے۔ دراصل حسن لقمان و ابو العینا، شبلی و رازی سے اگر مماثلت ہوگی تو جناب عبد الماجد صاحب کو مجھے تو اس حرف غلط کا بھی مرتبہ حاصل نہیں ہے جسے ان حضرات نے لکھ کر کبھی محو کر دیا ہو۔ بہرحال اس سے میرے اندر جو کیفیت پیدا ہوئی وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ میرے عیوب اور زیادہ مجھ پر ظاہر ہونے لگے۔

تن کی پوشش سے بڑھی کچھ اور عریانی مری

تکفیر کے باب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، سو اس کے متعلق مجھ ایسے شخص کو کیا خوف ہو سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

اس بارہ میں آپ نے میری آزادی خیال کو نگار میں ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ میرے نزدیک تو کافر اور کافر گر سب مسلمان ہیں اگر وہ انسان ہیں ورنہ غیر انسان مسلمان بھی کافر ہے۔

---

مکرمی و معظمی تسلیم

آپ کے حال کے پرچہ نے مجھکو جو صدمہ پہونچایا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ آپ نے مولانا دریابادی کے مضمون بابتہ پردہ پر نکتہ چینی کرکے اپنے کو بھی انہی حضرات کے زمرہ میں شامل کرلیا۔ افسوس آپ کو یہ نہیں معلوم کہ آپ کے مداح جتنے اسکولوں اور کالجوں میں ملیں گے شائد اور کہیں نہ ملیں۔ قل اعوذی ملاؤں کے خلاف جو جہاد آپ نے کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے اور ہمیشہ سے آپ کا رویہ ایسا رہا ہے کہ آپ نے مذہب میں جا و بیجا سختی کی مذمت کی پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے گزشتہ مضامین کی ہم پیروی کریں یا اس مضمون کی جن خیالات کی آپ نے نشوونما کی اور جن پودھوں کو آپ نے نگاگران کی آبیاری کی کیا آپ انہی کو اب کاٹنا چاہتے ہیں۔ جن اصول کی آپ نے تبلیغ کی انہی کی اب آپ مخالفت کرتے ہیں۔ آپ کا میں اب سے نہیں بلکہ ایک مدت سے مداح ہوں جبکہ میں نویں جماعت میں تھا اور عقیدت کا یہ عالم تھا اور اب بھی ہے کہ یہ امر طے تھا کہ شادی کیجائیگی اور اس بہانہ سے آپ سے اظہار عقیدت کیا جائیگا۔ پردہ کے خلاف ویسے تو آج کل بیسیوں ہیں مگر میں نے سب سے زیادہ اسکی مخالفت کی اور واقعہ یہ ہے کہ ملکۂ ثریا کے پردہ اٹھانے سے پیشتر سے مخالفت کر رہا ہوں اور اسی ایک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے قرآن و فقہ و تفسیر و حدیث کی آپ کی تقلید کرکے اور آپ کے اصول کو مدنظر رکھکر باضابطہ اور بڑی محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کی جس کا نتیجہ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں پبلک کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کرکے اسکو پریس میں بھیجدیا جبکے بعد آپ کا مضمون پردہ کے خلاف نظر پڑا جس امام کی پیروی کی اور جس کی تقلید کی اور جس سے غائبانہ بیعت ایک مدت سے تھی اس سے ایک دم سے اس بیعت کو توڑ دیا۔ مگر طبیعت کا خلجان دور نہ ہوا تجدید ایمان کے لئے آپ کے گزشتہ مضمون پڑھے اور تھوڑی ہی دیر میں پھر وہی پیشتر کی سی کیفیت ہوگئی۔ وہی اعتقاد اور وہی پیروی

کا شوق۔ مگر پھر جو مضمون کو پڑھا تو عقل کام نہیں کرتی۔ لہذا یہ طے کیا اور دعا مانگی کہ یہ مضمون کسی دوسرے کا ہو۔ آپ میری عقیدت مندی سے بے نیاز نہیں اور میری ارادت سے مستغنی ہیں مگر براہ کرم میرے لئے کوئی نسخہ تجویز کیجئے کہ کیونکر آپ کی عقیدت مندی اور ارادت سے سبکدوشی حاصل کروں۔ اس معمہ کو حل کیجئے کہ کیونکر آپ پردہ کے مخالف ہو کر پھر موافق ہو گئے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں نے آپ کے خیالات کے سمجھنے میں غلطی کی تو یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا ایسے موقعہ پر آپ ہماری قیادت سے سبکدوشی حاصل کر رہے ہیں اگر جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ ہر ذی ہوش اور سمجھدار آدمی کے لئے آپ کی راے جمیعتہ العلما کے فتوی سے زیادہ وقعت رکھتی ہے کیونکہ یہ میرا مذہب ہے کہ جو فلسفۂ جدید سے ناواقف ہے وہ قرآن واسلام کو حشر تک نہ سمجھے گا اور لوگوں کو گمراہ کریگا جیسا کہ یہ حضرات کر رہے ہیں۔ میرے لئے جمیعتہ العلما کی مخالفت ایک بے ہنگام غوغا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی مگر آپ اگر مخالفت میں ایک سطر لکھ دیں تو وہ مجھکو کہیں زیادہ ہے۔ کسی اور مولوی کے لکھنے پر میں التفات بھی نہیں کرتا اور بیسیوں مضمون جن میں مجھکو خوب دل کھول کر کوسا ہے میں نے کوڑے میں پھینک دئے اور محض یہ کہکر ٹال دیا کہ جاہل ہیں خرافات بکتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جمیعتہ العلما کو مذہب سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ ایک جاہل کو ہوسکتا ہے۔

میں نے جیسا کہ کہہ چکا ہوں آپ سے بیعت غائبانہ کو توڑ لیا اور پھر مجبوراً اسکی دوبارہ تجدید کرلی اور دل کو یوں اطمینان دلایا ہے کہ آئندہ کبھی آپ کا پردہ کے بارہ میں کوئی مضمون نہ دیکھونگا یعنی ان مضامین کو جو پردہ کی مخالفت میں ہیں یا ہوں گے۔ چنانچہ اس خط کے لکھنے کا منشا یہ ہے کہ اس غائبانہ بیعت کی آپ سے پھر تجدید کرلی جسکو کہ توڑ چکا تھا لیکن یہ ہمیشہ کے لئے طے کر لیا کہ پردہ کے باب میں جو آپ کے خیالات اب ہو گئے ہیں ان کی کوئی خاص وجہ ہوگی جس سے ہمکو تعلق نہیں۔ لہذا آپ کا بہترین معتقد اور پیرو ہوتے ہوئے بھی پردہ کے مسئلہ کے بارہ میں آپ کی مخالفت کرونگا اور اگر آپ اپنے عقیدت مندوں کی فہرست میں سے اس بنا پر میرا نام خارج کرنا چاہیں تو بیکار ہے کیونکہ میرا نام اس لسٹ میں ہے جسکی دوسری کاپی خود آپکے پاس بھی نہیں ہے اسی سلسلہ میں ایک مضمون ایک اخبار میں آپ کے خلاف بھیج چکا ہوں۔ وہ تجدید بیعت سے پیشتر کا لکھا

اور خدا کرے ڈاک میں کھو گیا ہو اور اگر شایع ہو بھی تو آپ کی نظر سے اور نیز میری نظر سے نہ گزرے

مجھکو انتظار ہے کہ دیکھوں آئندہ ماہ میں پردہ کے بارہ میں آپ کا مضمون میرے پڑھنے کا ہے یا نہیں خدا کرے آپ اس مسئلہ کا تذکرہ ہی نہ کریں۔

عظیم بیگ چغتائی بی اے (علی گڈھ)

(نگار) آپ نے جس خلوص و محبت کے ساتھ مجھے ملامت کی ہے، اس کا اقتضار تو یہی تھا کہ میں اس کی لذت سے بالکل خاموش لطف اُٹھاتا اور سوائے اپنے کسی دوسرے کو اس میں شریک نہ کرتا، لیکن چونکہ میرے گزشتہ ماہ کے نوٹ نے اور بھی بعض حضرات کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے اس لئے میں آپ کی اس تحریر کو ان سب کی طرف سے شایع کر کے بتا دینا چاہتا ہوں کہ پردہ کے باب میں جو رائے میں ایک بار قایم کر چکا ہوں اس سے ہٹنے کی کوئی وجہ اس وقت تک میں نے نہیں پائی۔ جناب عبد الماجد صاحب دریابادی کی رائے کے خلاف میرا اظہار خیال اس بنا پر نہ تھا کہ میں پردہ کا حامی ہوں، بلکہ جناب دریابادی کی اس ذہنیت کو ظاہر کرنا تھا کہ جب اُن کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ خود بھی کلام مجید کی تاویلیں کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھتے، خواہ وہ کتنی ہی کمزور اور بودی کیوں نہ ہوں

میں اس سے قبل نہایت صفائی سے نگار کے صفحات میں لکھ چکا ہوں کہ ہرچند کلام مجید میں چہرہ چھپانے کا حکم ہے لیکن یہ صرف اس زمانہ اور وقت کے لئے مختص تھا اور دوامی پابندی کو ظاہر نہیں کرتا۔ میں چونکہ معاشرتی معاملات میں ضرورت کے لحاظ سے تبدیلی احکام کا قایل ہوں اس لئے باوجود اس کے کہ کلام مجید میں چہرہ چھپانے کی ہدایت کی گئی ہے، میں اپنے اس اصول کے مطابق اس کی تاویل کر سکتا ہوں، لیکن عبد الماجد صاحب تو اس باب میں مجبور ہیں اور وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتے کہ جب ضرورت ہو تو اسی قسم کی بیجا تاویلیں کریں۔ میرا مقصود پردہ کے متعلق گفتگو کرنا نہ تھا بلکہ صرف یہ بتانا تھا کہ

نہ از دستی اِس کو نہ آستیناں ہیں

آپ خدا کے لئے سلسلۂ بیعت کو نہ توڑیئے خواہ وہ اسی صورت سے کیوں نہ ہو کہ مجھے آپ کے سامنے دست ادارت دراز کرنا پڑے

---


## نگار کے ذیل کے پرچوں کی ضرورت ہے

جلد ۲...... جولائی ۱۹۲۲ء اور ستمبر ۱۹۲۲ء (عدا اور ۳)

جلد ۳...... جنوری ۱۹۲۳ء، مارچ ۱۹۲۳ء، اپریل ۱۹۲۳ء، مئی ۱۹۲۳ء اور جون ۱۹۲۳ء (عدا و ۳ و ۴ و ۵ و ۶)

جلد ۸...... جولائی ۱۹۲۵ء، ستمبر ۱۹۲۵ء، اکتوبر ۱۹۲۵ء، نومبر ۱۹۲۵ء، دسمبر ۱۹۲۵ء (عدا و ۳ و ۴ و ۵ و ۶)

جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں۔

محمد عمر صدیقی معرفت جیت سنگھ گوربخش سنگھ اینڈ برادرس بمبئی نمبرا

# باب الاستفسار

## تفکر فی القرآن

(مسٹر رؤف احمد بی اے وکیل لکھنؤ)

میں نے آپ کے نگار ماہ مئی ۲۸ء کو دیکھا اور اس میں آپ کا مضمون بہ جواب مضمون عبدالماجد صاحب دریا بادی پڑھا جو متعلق وجود خضر کے تھا۔ عبدالماجد صاحب کے مضمون میں حصہ تمہید سے آپ بہت ناراض ہو گئے اور اس کی تردید میں جو جو دلائل اور اصول بیان کئے ہیں ان کو بالکل خلاف امید پایا۔ جس طرح آپ نے ماجد صاحب کے نفس مضمون سے علٰحدہ ہو کر اس کے صرف ایک حصہ سے بحث کی ہے اسی طرح میں بھی بقیہ تمام مسائل سے علٰحدہ ہو کر صرف آپ کے دلائل پر انہیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں اور وہ اس واسطے کہ آپ نے جو اصول آزاد خیالی و تنقید مسائل مذہب بیان کئے ہیں ان سے مجھکو اتفاق نہیں ہے

میں یہ تسلیم کرنے کو طیار ہوں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہو گیا اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہم متقدمین کے نظریہ اور ان کی تحقیقات کو نظر انداز کر سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے خلاف معقول اور زبردست دلائل پیش کر سکیں۔ محض یہ کہکر اکتفا کرنا کہ وہ "دفتر بے پایاں ہے" نہ ان کے "پشتارہ نگی" اہمیت کو کم کرتا ہے اور نہ ان کی تردید

نیاز صاحب۔ معاف فرمائے گا میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو غلو اور جوش اپنے اس مضمون میں ظاہر کیا ہے وہ صرف اس خیال سے جائز کہا جا سکتا ہے کہ آپ ایک ایسے اعتراض کا جواب دے رہے تھے جو خاص کر آپ کی ذات کے خلاف کہا گیا۔ ورنہ اگر میزان عقل میں اسکو رکھا جاوے تو نتیجہ مایوس کن ظاہر ہو گا۔ میں تسلیم کرونگا کہ آپ سب سے بڑے مجتہد ہو سکتے ہیں اور میں یہ بھی تسلیم کرونگا کہ آپ کی "فکر و تدبر" بمقابلہ تمامی متقدمین کے بالکل جدید اور حیرت انگیز معلومات دنیا کے سامنے پیش کر سکتی ہے لیکن بااینہمہ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ متقدمین کی کتابوں کا "پشتارہ" ایک دفتر بے معنی ہے اور نہ میں اتنا آزاد خیال ہوں کہ "ایک مسلمان کے نزدیک مندر کے ناقوس اور کلیسا کے گھنٹہ کو بھی ویسا ہی عزیز ہونا چاہئے جیسا کہ وہ اذان سنتا ہے"۔

میں حیران ہوں کہ اس فتوے کی سند آپ کو کہاں سے ہاتھ آئی کہ "اگر ضرورت ہو تو خود (ایک مسلمان کو) ناقوس پھونکنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے"۔ غالباً آپ کلام مجید سے اس کی سند پیش کر سکینگے میری رائے میں تو یہ تعلیم بالکل وہی ہے کہ اگر ایک گال پر کوئی تمانچہ مارے تو دوسرا گال اسکے سامنے کر دینا چاہیئے جو بالکل فطرت انسانی کے خلاف عقل کے خلاف اور دنیا کے تجربہ کے خلاف ہے۔ پھر مسئلہ تو صاف ہے لیکن تعجب ہے کہ آپ جیسے محقق کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا کہ "جب اذان و ناقوس کا مقصد بالکل ایک ہے جب ان دونوں سے مراد نمازیوں یا پجاریوں کو نماز یا پوجا کے لئے بلانا ہے تو پھر یہ نزاع و مجادلہ کیسا"۔ غرضکہ اسیطرح آپ نے بہت سے دعاوی ایسے پیش کئے ہیں جن کی نسبت میں بلا پس و پیش کہنے کو طیار ہوں کہ آپ کی "فکر و تدبیر" نے قرآن پاک کے سمجھنے میں غلطی کی۔ اگر یہ دریافت کروں تو غالباً مضایقہ نہیں کہ اگر آپ کا کلیہ تسلیم کر لیا جاوے اور ہر مسلمان ناقوس بجانے کو طیار ہو جاوے اور وہ نزاع و مجادلہ بھی جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتا دور ہو جاوے تو پھر مذہب کیا چیز ہوگا اور پھر کونسا امر امتیازی ایک کو دوسرے مذہب سے علیحدہ کرے گا اور اگر ہوگا تو کیا اور اگر نہیں تو پھر قرآن پاک کی تعلیم اور دنیا کے کسی مذہب کی کتاب کو زیر بحث لانیکی کیا ضرورت، اگر تمام مذاہب صرف ایک منزل پر پہونچنے کے لئے متعدد راستہ ہیں تو پھر "اپنی منزل" کے کیا معنی۔ منزل تو عام ہے کوئی خاص نہیں

یہ صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں معقول کے بغیر صرف منقول سے کام نہیں چلتا لیکن کیا آپنے یہ غور فرمایا کہ ایک ماہر فن کی رائے کو دوسرے غیر ماہر فن کی رائے پر خواہ آخر الذکر کتنی ہی زبردست "فکر و تدبر" کیوں نہ رکھتا ہو ہمیشہ ترجیح دیجاتی ہے اور عقل بھی اس کو قبول کرتی ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنی عمر کسی ایک امر کی جستجو اور اس کی تحقیق میں صرف کی تو اسکی رائے بمقابلہ اس شخص کے جس نے محض تفریحاً جب قلم اٹھایا اپنی خداداد ذہانت کی امداد سے دس پانچ ورق کاغذ کے سیاہ کر دئے یقیناً مستحق زیادہ وزن اور اہمیت کی ہے۔ یہ تو آپ تسلیم کریں گے کہ دنیا کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ کوئی قوم قابل عزت نہیں سمجھی جاتی اور نہ وہ قوم قوم کہے جانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے اگر اس کے پاس کوئی اپنے اسلاف کے کارنامے موجود نہیں ہیں دنیا میں ہزاروں قومیں وجود میں آئیں اور نیست و نابود ہو گئیں آج اسلاف کا نام تک کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یونانیوں۔ رومیوں اور مسلمانوں کو کون بھلا سکتا ہے۔ یونانیوں کو اپنے متقدمین کے "پشتاروں پر" ناز ہے رومیوں کے "پشتارے" آج بھی دنیا کی رہبری کر رہے ہیں۔

انگریزوں کو اپنے "پشتاروں پر" فخر ہے۔ مسلمانوں کے "پشتارو بھی" آج بھی قدر شناس اور علم دوست دنیا قدر کرتی ہے۔ اگر ہم خود ان کی تذلیل روا رکھیں تو افسوس کا مقام ہے۔ پھر اگر یہ سوال کیا جائے تو آپ معاف فرمائیں گے کہ جناب کی "فکر و تدبر" نے احادیث و قرآن پاک کے سمجھنے میں جو کچھ معلومات بہم پہونچائی۔ اس کا ذریعہ وہی دفتر بے پایاں تھا یا اس سے بے نیاز ہو کر کوئی جدید ذریعہ حاصل کیا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ اسلام بالکل سیدھا سادھا مذہب ہے اور قرآن ہندؤں کا وید نہیں ہے جس کا سمجھنا صرف پنڈتوں ہی کے لئے مخصوص ہو لیکن ساتھ ہی وہ قصہ الف لیلی یا فسانہ عجائب نہیں ہے جس پر ہر شخص بغیر سوچے سمجھے رائے زنی کرے (اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ آپ جیسے محقق کو اس کا حق نہیں ہے) اگر آپ سیل کی تصانیف کو ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسے قابل فلسفی و مصنف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم ایک فلسفہ ہے۔ اور اس کے نکات دقیق ہیں۔ جو بغیر حقیقی فکر و تدبر کے حل نہیں ہو سکتے۔

آپ کے مضمون کو پڑھ کر میری رائے کم از کم یہ قائم ہوئی کہ مذاہب کا اختلاف بالکل لغو ہے اور کسی کو کوئی خاص مذہب اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنے خیال و فکر کے مطابق اپنا مذہب رکھ سکتا ہے۔ اور اپنے لئے اصول وضع کر سکتا ہے۔ لیکن تھوڑی سی الجھن یہ باقی رہتی ہے کہ آپ خود شاید اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور اسلام و نصرانیت و مشرک و منکر کے درمیان امتیاز قائم کرتے ہیں، جیسا کہ خود آپ کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے۔ تو پھر یہ متضاد اصول کیوں۔ "میں قطعاً عجز و انکسار بر بنائے رسم و رواج" سے کام نہیں لیتا بلکہ حقیقتاً عرض کرتا ہوں کہ میں نے عربی میں کوئی سند حاصل نہیں کی اور نہ قرآن پاک کے نکات کو سمجھنے میں "فکر و تدبر" سے آپ کے مثل وقت صرف کیا لہذا میں نہیں کہہ سکتا کہ صحیح "فکر و تدبر" کے دعوے دار آپ زیادہ ہو سکتے ہیں یا ماجد صاحب اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم و بخاری یا بیہقی و رازی کو آپ زیادہ آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں یا ماجد صاحب لیکن میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ براہ عنایت دوبارہ ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور فرما کر ہم لوگوں کو جو کم مائگی کے معترف ہیں ایک صحیح مشورہ دیجئے کہ در حقیقت قصہ کیا ہے لیکن گزارش یہ ہے کہ اس کے جواب میں غصہ سے کام نہ لیجئے گا جس طرح ماجد صاحب کے خلاف آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔ نگار میں آپ کے جواب کا انتظار کرونگا۔ اگر آپکو موقعہ و فرصت ہو۔

---

(نگار) آپکے ایراد و اعتراض یا استفسار و استصواب کو میں نے کئی بار پڑھا اور ہر مرتبہ میں نے غور کیا کہ آپ نے میرے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے، اس میں واقعی کوئی "ذاتی" مناقشہ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور کیا حقیقتاً میں ان اصول سے ہٹ گیا ہوں جن کی میں نے اس وقت تک استفسارات کا جواب دینے میں ہمیشہ پابندی کی ہے؟

قبل اس کے کہ میں بتاؤں کہ میرے اس غور کا نتیجہ کیا ہوا، یہ ظاہر کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "درک حقیقت" اور "رسائی کُنہ راز" تو خیر بڑی چیز ہے، علم و فضل کے کسی حقیر ترین شعبہ کے متعلق بھی میں علم و فن کا دعویٰ نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ اس میں مہارت و عبور اور اسی طرح بالکل ایک حقیقت کی صورت میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی شخص کے خلاف بغض و کینہ کی پرورش یا کسی کے طرز عمل سے متاثر ہوکر انتقام کی فکر کرنا بالکل میری فطرت کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ صفت صفات انسانی میں محمود خیال کی جاسکتی ہے تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اس کے عطا کرنے میں میرے ساتھ بہت زیادہ فیاضی سے کام لیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جس طرح میں اپنے آپ کو "حقایق عالم" "نوامیس فطرت" اور "نکات قدرت" کے سمجھنے کا نااہل پاتا ہوں، اسی طرح یہ بھی پورا یقین رکھتا ہوں کہ اسوقت تک کوئی بھی ان کا عالم پیدا نہیں ہوا ہے اور انسانی علم کی انتہائی پرواز اس سے زیادہ نہیں کہ وہ اپنے جہل کا اعتراف کرے۔ اس لئے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص میری تکذیب کرنا چاہتا ہے اس پندار کے ساتھ کہ جو کچھ اُس نے سمجھا ہے وہی صحیح ہے تو مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا اس خیال سے نہیں کہ اس نے مجھے کیوں نااہل مانا قابل، جاہل و عامی سمجھا بلکہ صرف اس بناء پر کہ وہ اپنے آپکو کیوں ماہر حقیقت سمجھتا ہے، جب کہ اس باب میں ہم اور وہ دونوں ایک ہیں۔ کسی انسان کا خواہ کتنا ہی بڑا محقق و فاضل کیوں نہ ہو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سمجھ لینا کہ اس کا علم صحیح ہے، میرے نزدیک انتہا درجہ کا شرک ہے کوئی اور نہیں سکتا۔ علی الخصوص مذہب کے معاملہ میں کہ یہاں جبر و اکراہ کا کام ہی نہیں۔ میں نے قدماء کے "ستاروں" کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اب بھی اسی کا اعادہ کرتا ہوں اور میرے نزدیک اسلام نام اس بلندی نظر اس وسعت آغوش کا ہے جو ناقوس اذان، مسجد و کلیسا کی پابندی و امتیاز سے بہت زیادہ بلند چیز ہے۔

پھر میں تو یہ نہیں کہتا کہ آپ بھی اسکو تسلیم کریں، لیکن میرا مسلک یہی ہے اور میں اس باب میں کسی کا معتقد نہیں ہوں۔ مذہب اگر کوئی اختیار کرونگا تو خود سمجھ کر کسی کے سمجھانے سے نہیں، اپنی فہم کی بنا پر ابو حنیفہ یا شافعی کی تحقیق سے نہیں۔

اب رہا آپ کا یہ اعتراض کہ اگر مذہب میں اس قدر آزادی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر شخص اپنے فکر و خیال کے مطابق اپنا مذہب قایم کرسکتا ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا حرج ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں اس مضرت رساں پہلو کو واضح نہیں کیا جو غالباً آپ کے پیش نظر تھا۔ یعنی یہ کہ اس صورت میں مسلمانوں کی اجتماعیت جاتی رہیگی اور شیرازہ قومی منتشر ہو جائے گا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں

کہ کیا مذہبیت اور قومیت کے شیرازے سے انسانیت کا رابطہ زیادہ وسیع و مستحکم نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آپ رشتۂ قوم و مذہب یا رابطۂ وطن کو ضروری سمجھتے ہیں اور اپنی نگاہ کو زیادہ وسیع کر کے اس تعلق کو کیوں نہیں پیدا کرتے جس میں تمام نوع انسان شامل ہو سکتی ہے اور جو حقیقی ذریعہ امن عام قایم کرنے کا ہے۔

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے، اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں ہے جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، کیونکہ اس نے عوائد و مراسم کی بیخ کنی کر کے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقیاً مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔

سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اسلئے انکار کرنا آسان نہیں ہے تاہم چونکہ اس وقت بات آپڑی ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر یہاں روشنی ڈالوں۔ انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جس حد تک یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ خالق یا خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے اور مخلوق یا انسان کی کوئی بدعنوانی، کوئی نامعقولیت، یہانتک کہ بتوں کو پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہونچا سکتا، نہ اس کی برہمی انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہے اور وہ خفا ہو جاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی امر مفید کسی سے ظاہر ہوا اور ہم اس سے خوش ہو گئے۔ چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت و الم سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا۔ پھر اس مفہوم کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقتاً ہماری بہتری سے تعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری مضرت سے ہے۔ اس لئے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشا صرف یہ ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدابیر اختیار کرے جیسا کہ "ان ارید الا الاصلاح" سے ثابت ہوتا ہے اور اُن مکارم اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرے جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر کفر و اسلام شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی، کہ اسلام و توحید نام ہے صرف "استقامۃ فی العمل" کا بلندی اخلاق کا، اخوت عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں نظم و نسق سے منحرف ہو جانے کو، ترک عمل کو، انحطاط اخلاق کو، تشتت و افتراق کو، فرقہ بندی کو تفریق جامعۂ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔

کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کے پورا کرنے لئے آئے تھے اسی لئے اُن کو "کافۃ للناس" اور "رحمۃ للعٰلمین" کے لقب سے یاد کیا گیا۔

رسول نے فرقہ بندی کے خلاف اور تفریق مذاہب کے باوجود "اخوت عامہ" کے موافقت میں جو کچھ کیا یا کہا اس کا ثبوت خود کلام مجید سے ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

قل امنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسمٰعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربھم۔ لانفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون ۝

پھر کیا نبیوں میں، آپ رام، کرشن، بودھ، کنفیوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے، کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے "ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا" (ہم نے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی مبعوث کیا) ارشاد خداوندی ہے - پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ "ونحن لہ مسلمون" میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے

کلام پاک کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ ساری دنیا ایک جماعت، ایک امت ہو کر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں۔

ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء ولتسئلن عما کنتم تعملون ۰

یہاں "ولو شاء اللہ" کے معنے یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا" بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنا دے لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے اس کو جو اپنی گمراہی چاہتا ہے - اور ہدایت دیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے لیکن اے لوگو تم مطمئن نہ ہو خدا تم سے ضرور باز پرس کریگا - تمہارے افعال و اعمال پر اور تم سے پوچھیگا کہ کیوں تم نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کیا - اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعت نظر سے اپنی رواداری سے اور اپنے اصول زندگی سے اُس اخوت عامہ کو دنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے۔

"یضل من یشاء اور یھدی من یشاء" کے معنی بھی بعض مفسرین اور مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں - اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے - یعنی انھوں نے "یشاء" کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے - حالانکہ حقیقتاً "یشاء" کا فاعل "من" ہے اگر آپ یہ معنے مراد نہ لیں گے تو پھر "ولتسئلن عما کنتم تعملون" بالکل بیکار ہو جائیگا، کیونکہ جب ہدایت و گمراہی صرف خدا ادا بات ہوگئی تو باز پرس کیوں اور کس سے ؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے اور اس کی وسعت و ہمہ گیری کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :-

صبغۃ اللہ، ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون ۰

یعنی اے رسول لوگوں سے کہدو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے - اس لئے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ :-

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون ۰

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوائے ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور ہستی کو اس کا مقابل سمجھا جائے - یہ تعلیم اس قدر سادہ، اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سے گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں

نہیں کرسکتی۔

ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک و کفر، جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اس کے برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہونچانے والا ہو، جو اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو، جو مرکز انسانیت میں انحراف پیدا کرنے والا ہو جس سے اشتراک عمل تباہ ہوتا ہو اور جس سے رشتۂ تمدن اور شیرازۂ تعاون کمزور ہوجانے والا ہو، وہی شرک و کفر ہے، وہی جحود و انکار ہے، وہی بت پرستی ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا منشار خداوندی کے منافی ہے اور کسی کے منشار و حکم کے خلاف کرنا اُس کی اہمیت سے انکار کرنا ہے، اسی کے وجود کو نظر انداز کردینا ہے اسکی مخالفت پر آمادہ ہونا ہے۔

اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کرسکتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو فائدہ پہونچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان، نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت ملتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔ اگر ایک شخص غیر مسلم (یعنی موجودہ جماعت اسلامی کا فرد نہ ہونے) کے باوجود تمام اُنہیں مکارم اخلاق اور محاسن فطرت سے آراستہ ہے جن کی محمدؐ نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ اُسکو صرف اس لئے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے، کافر و مشرک کہکر ناری اور جہنمی کہدیں گے اور دوسرا شخص جو آپ کی جماعت کا فرد ہے لیکن حد درجہ ظالم، بے رحم، مجرم اور شقی ہے، اس کو صرف اس بنا پر کہ اس کا نام بھی آپ ہی کی طرح ہے، آپ کے اعزہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، اس کو نجات و فردوس کا پروانہ دیدیں گے۔

ایک بے رحم قزاق جو قافلہ کے قافلہ کو تباہ و برباد کرکے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کرکے فارغ ہوتا ہے۔ کہ دفعتہً مغرب کی اذان ہوتی ہے، وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کرکے نماز میں مشغول ہوجاتا ہے۔ دوسرا شخص جو تمام تمام دن دھوپ میں محنت شاقہ برداشت کرکے اپنے متعلقین کے لئے حلال روزی فراہم کرتا ہے، گانوں کے بچوں بوڑھوں، یتیموں، بیواؤں کی خدمت کے لئے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے، لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے، مسجد میں جانے کے بجائے وہ مندر کا رُخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت کیجئے، وہ نہایت آزادی سے بلا پس و پیش کہدیگا کہ بہرحال اس قزاق کو نجات ملتی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اسی دوسرے کو آخر کار دوزخ میں جانا ہے کیونکہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔

پھر اگر اسلام نام اسی وسعت و نظر و انصاف کا ہے، اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں اگر "واٰمرھم بالقسط" کا یہی مفہوم ہے

اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دونگا کہ آئیے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہو جائیے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملیگا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کر لینا کہ خدا صرف المسلمین کا ہی اور دوسری قوموں کو اُس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا کیا ہی ایک ایسا لغو و مہمل اعتقاد ہی جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہی مسجد و کلیسا، ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہی، اگر دونوں جگہ مقصود خدا کی عبادت اور اصلاح اعمال ہے۔ یقیناً میں ناقوس پھونکنے کے لئے آمادہ ہوں اور ناقوس پھونکنے ہی کو اسلام سمجھونگا اگر اس سے میرے اخلاق پر کوئی اچھا اثر پڑیگا۔

آپ جب تک اس رواداری سے کام نہ لیں گے، جسوقت تک خیال میں یہ وسعت نہ پیدا ہوگی آپ کیونکر دوسروں سے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی جماعت میں شریک ہو جائیں گے۔ آپ تو ناقوس کی آواز سنکر لاحول پڑھنے لگیں لیکن دوسرا آپ کی اذان کو سنکر سر بسجود ہو جائے، باجہ بجانا چھوڑ دے۔ کیوں؟ آپ میں آخر وہ کون سی خصوصیت ہی جس نے آپ کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور دوسرے کو گروہ شیطان و طاغوت میں داخل کر دیا آپ کیوں خدا کی ذات کو اپنے اندر محدود سمجھتے ہیں۔ اس کی صفت خلق و ربانیت کو اپنے لئے کیوں مخصوص جانتے ہیں، بحیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو، جینی ہو یا بودھ معتزلہ ہو یا اشعریہ ناصبی ہو یا خارجی، شیعہ ہو یا سنی، خدا کے نزدیک ایک ہی اس کا ہی ایک مطالبہ سب سے ہی، پھر جو اسکو پورا کریگا خدا اسی کو ترقی و فلاح دیگا اور جو اس کو ترک کریگا خدا بھی اُس کو چھوڑ دیگا۔

بیشک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا، یقیناً بہترین ذریعہ تصفیۂ اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ہی اور اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے، لیکن میں اس کی تعلیم و اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو بُرا کہوں جب کہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں اس کی طریق عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ اُس کو نفس مقصود مذہب سے آگاہ کر کے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریق مذہب کے ساتھ ہی ساتھ اسلام کو بھی دیکھے اور وہ خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہونچانے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کونسا ہے اور میری رائے میں "جادلھم بالتی ھی احسن" کا بھی یہی مفہوم ہے۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے۔ یہ عام اصول اخلاق کا ہی۔ اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قایم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ قوت و جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہو سکتا ہی تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہی، وضع و معاشرت میں تبدیلی پیدا کر سکتی ہی، لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی، دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی اطمینان نفس طمانینت روح، لطف و رافت، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہی جس کے ثبوت میں اسوۂ نبوی آپ کے اور ہمارے

سب کے سامنے موجود ہے، اور یہ چیز مسلمانوں کے پاس ایسی عظیم المرتبت، ایسی جلیل القدر ہے کہ اس کے سامنے سوائے سرِ عجز جھکا دینے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ پھر کتنی حیرت کی بات ہو کہ جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہو اسے تو پیش نہیں کرتے، دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو اور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ اُنھیں کو جواہر ریزے سمجھو۔

پھر چونکہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے مقلدین میں پائی جاتی ہو اس لئے جو اعتراض میرا اہل اسلام پر ہو وہی ہندوؤں پر ہو اور وہی دوسرے مذہب والوں پر۔ نہ ہم میں رواداری، نہ ان میں انصاف، نہ ہم صراطِ مستقیم پر نہ وہ راہِ راست پر، منزل سے بعید ہونے میں سب کا ایک درجہ ہو اور گمراہی میں مبتلا ہونے کے لئے سب یکساں طور پر حریص ہیں۔

یہ ہو میرا اعتقاد و یقین مذہب کے متعلق جسے میں نے صاف صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا اور اگر متقدمین کی تعلیم اس کی منافی ہو تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں، جس طرح میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ میرے قول کو صحیح سمجھ لیں۔ لیکن اگر موجودہ حالت قائم رہی اور رہیگی تو یاد رکھیئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہو جائیں گے اور پھر وہ وقت تجدید اسلام و احیاءِ دینِ محمدی کا ہوگا"

ملتیں جب مٹ گئیں، اجزاءِ ایماں ہو گئیں۔

نیاز


برعوض ایک یا دو اشیاء کی
خریداری پر کوئی رعایت نہیں

# سب اشیاء کی یکجائی قیمت صرف دس روپیہ ۱۰/-

مندرجہ ذیل پانچوں اشیاء کی قیمتوں کا میزان اٹھارہ روپیہ ہوتا ہو لیکن سب اشیاء یکمشت طلب کرنے پر معہ محصول ڈاک پیکنگ صرف دس روپیہ میں روانہ کیجاویں گی آٹھ روپیہ کی رعایت سے آپ متعجب ہوں ہمارا منشا قلیل منافعہ پر بہترین اشیاء خریداروں کو بہم پہنچانا ہو۔ ہر شے کی جو اوصاف تحریر کئے گئے ہیں ان میں اشتہاری مبالغہ قطعی نہیں ان اشیاء کی خوبصورتی، پائداری اور ارزانی کا حال آپکو استعمال کرنے ہی سے بخوبی معلوم ہوگا۔

کار آمد فاؤنٹن پن
ولایت کی جدید ساخت ہو ایک مرتبہ سیاہی بھر کر صفحہ کے صفحہ لکھ ڈالیے۔ گردن نکل ہی سیر جسے نہایت رواں و آسانی سے چلتا ہو اور برسوں کام دیتا ہے۔ قیمت معہ محصول ڈاک ۱۲؎

ڈبل الارم ٹائم پیس
گارنٹی ایک سال
دو گھنٹی کی بلند آواز سے آپکو ٹھیک وقت پر بیدار کریگا، وقت ہمیشہ صحیح بتائیگا بغیر گھڑی ساز کی مدد کے برسوں کام دیگا، درجہ کاریگروں کو اسکی مشین پر ناز ہی۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک چار روپیہ

لیور پاکٹ واچ
گارنٹی ۵ سال
ایک مستند کاریگر کی ساخت ہونیکے باعث مشین کی مضبوط وقت کی سچی۔ دیکھنے میں خوبصورت ہے۔ قیمت معہ محصول ڈاک
پانچ روپیہ صہ

نفیس رسٹ واچ
گارنٹی ۷ سال
۲۲ کیرٹ گولڈ پلیٹیڈ رسٹ واچ اپنی خوبی میں پچاس روپیہ کی گھڑی سے مقابلہ کرتی ہے از حد خوبصورت اور بہت پائدار ہے کاریگری کی جدید ساخت ہو۔ قیمت معہ محصول ڈاک چھ روپیہ ۶

سنہری خولدار چوڑیاں
انکے اندر چکدار رنگ برنگ کی ریشمی چوڑیاں ہونیکے باعث نیلم پکھراج کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ مستورات کیلئے بہترین تحفہ ہیں۔ قیمت مکمل سٹ معہ محصول ڈاک ایکروپیہ آٹھ آنہ

(نوٹ ۱) جو صاحب فاؤنٹن پن یا چوڑیاں دونوں میں سے ایک اشیاء خریدنا چاہیں انکو بقیہ چاروں اشیاء مبلغ نو روپیہ میں روانہ کیجاویں گی (نوٹ ۲) جو صاحب فاؤنٹن پن اور چوڑیاں دونوں اشیاء خریدنا نہ چاہیں انکو بقیہ تینوں گھڑیاں آٹھ روپیہ میں روانہ کی جاویں گی۔

ملنے کا پتہ:- اچیپ واچ ہاؤس اجمیری گیٹ دہلی

# دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو!

اس نظم کا عنوان، "آرائشِ محفل" کے ایک غیر فانی فقرہ سے ماخوذ ہے، جس کی بلاغتِ ادا، دنیائے ذوق میں ہمیشہ یادگار رہیگی ——— "آرائشِ محفل" میں اس فقرے کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ حاتم طائی کا کسی سرسبز وادی میں گزر ہوتا ہے ——— دامنِ کوہسار میں، ایک دیوانۂ افکار "آوارۂ شباب" آنکھیں بند کئے، "کسی خیال" میں مست، انتہائی دلگرفتگی کے ساتھ اشکبار ہے اور زبان پر یہ نالۂ بے اختیار کہ ———

ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے!!

حاتم، اس کی صدائے درد سنتا ہے اور بیتاب ہو کر پاس جاتا ہے ——— وہ اپنا افسانۂ غم دہراتا ہے اور بالآخر حاتم کی کوشش سے اپنی مراد کو پہونچ جاتا ہے ———

ہمیں یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اس "آوارۂ نجد" کے ہمنواؤں سے دنیا اب بھی خالی نہیں ہے، اور کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں سے، یہی فریادِ حزیں، گو نجتی، سنائی دے جاتی ہے ——— تقریرِ این حالت اس فقرے کو موضوعِ شعر قرار دینا، امید ہے ہدفِ سرزنش نہیں بنایا جائیگا۔ کیونکہ اس نظم میں جو روح صرف ہوئی ہے، "وہ" ——— بہرکیف وہی ہے جو حاتم کے زمانے میں، عنوانِ نظم کی صورت میں بروے کار آئی تھی۔ البتہ فرق یہ ہے کہ ——— پہلے آوارگانِ محبت کی بھٹکی ہوئی بھولی روحوں کو "حاتم و خضر" کی رہنمائی نصیب ہو جاتی تھی، مگر آج کل کے لذت چشیدگانِ غم کے آنسو پونچھنے کے لئے کوئی خدا کا بندہ آمادہ نہیں

اختر شیرانی

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے! شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے!
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے!
روپہلی چاندنی نے، رات کو کھلی چھت پر ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے!
بہارِ صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے! نسیم نے تمہیں مستانہ وار دیکھا ہے!
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے!

قریبِ شام، تمہیں طائرانِ گلشن نے
ہزار بار، سرِ لالہ زار دیکھا ہے!!

بہشتِ حسن کی ننھی کلی کے دھوکے میں!
سحر نے بھی، تمہیں دیوانہ وار دیکھا ہے!!

سنہرے پانی میں، چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار، دیکھا ہے!

ہمیشہ رات کو محوِ مطالعہ تمکو!
نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے!

کبھی، جو اٹھی ہو گیسو سنوارنے کیلئے
تو آئینے نے تمہیں ہمکنار، دیکھا ہے!

گھٹا نے دامنِ کہسار میں تمہیں اکثر
اسیرِ زمزمۂ آبشار، دیکھا ہے!

عروسِ برق نے اپنا نقاب الٹ کے تمہیں
غریقِ مستیٔ ابرِ بہار، دیکھا ہے!

کسی خیال میں کھوئے تمہیں اکثر
نگاہِ گل نے تہِ شاخسار، دیکھا ہے!!

نسیمِ باغ نے زیب النسا سمجھ کے کبھی
تمہیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے!

غرض۔ مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تمکو!
ہزار بار، نہیں! لاکھ بار دیکھا ہے!

مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے!
کہ اس نے تمکو فقط ایکبار دیکھا ہے!!!

دکھا دو! ایک جھلک، اور ــــــ بس نگاہوں کو!!!
"دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس" نگاہوں کو!!!

اختر شیرانی

# جلوۂ سحر

خاموش فضا میں وقت سحر جذبات کا دریا جاری ہے
اک کیف کا طوفاں امڈا ہے اک وجد کا عالم طاری ہے

وہ چاک ہوا دامانِ سحر وہ ظلمت شب کافور ہوئی
عالم عالم پر نور ہوا دنیا دنیا مسرور ہوئی

وہ کرنیں نور کی نکلی ہیں خورشید کے زریں ساغر سے
وہ بادۂ سرخ چھلکتا ہے ہر پھول کے رنگیں ساغر سے

وہ بادِ صبا مستانہ چلی وہ پتلی شاخیں ہلنے لگیں
وہ پتے آگئے جنبش میں وہ نازک کلیاں کھلنے لگیں

خاموشیِ شب تحلیل ہوئی چڑیوں کی ترنم ریزی میں
شبنم کی نظر افروزی میں پھولوں کی شمیم انگیزی میں

ہر شاخ میں رنگا رنگی ہے ہر پھول میں بوقلمونی ہے
ہے ایک تناسب ہر شے میں ہر چیز میں اک موزونی ہے

ہے جنت گوش اک اک نغمہ ہر منظر ہے "فردوس نظر"
پہلو میں ہو دل گھٹنوں رقصاں احساس کا ہو کچھ ذوق اگر

اسوقت عروس فطرت کی زیبائش دید کے قابل ہے
ہر غمزہ اس کا ظالم ہے ہر عشوہ اس کا قاتل ہے

ہر سو ہے سعادت کی تابش ہر سمت ہے بارش رحمت کی
تنویر سحر ہے ایک ضیا رخسار عروس فطرت کی

موسم نہیں خواب غفلت کا موقع نہیں سہل انگاری کا
اٹھ اے غافل بیدار ہو اب ہے وقت یہی بیداری کا

کافر ہے وہ دل اسوقت بھی گر جس دل میں خدا کی یاد نہیں
ملحد بھی اگر دیکھے یہ سماں سجدے میں جھکا دے اپنی جبیں

پیغام عمل پھر لائی سحر پھر دنیا اپنے کام میں ہے
سرگرم ہے کوئی طاعت میں کوئی بادہ و جام میں ہے

کچھ میری نہ پوچھو اے رندو اک گوشۂ باغ میں بیٹھا ہوں
مخانۂ فطرت میں ہر دم صہبائے مسرت پیتا ہوں

ہر سو ہیں شگفتہ لالہ و گل پر کیف ہوائے گلشن ہے
اک ہاتھ میں جام صہبا ہے اک ہاتھ میں انکا دامن ہے

سید شاہ ولی الرحمٰن ولی


# تاریخ ادب اردو

جسمیں نظم و نثر اردو کی تاریخ دو حصوں میں شروع سے اسوقت تک نہایت تشریح اور تصحیح کے ساتھ مع مفصل حالات شعرائے ماضی و حال درج ہے۔ زیر تیاری ہے اور جلد شائع ہونے والی ہے۔

مینیجر نولکشور پریس صیغہ بکڈپو لکھنؤ

# جوشش بہار

جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے

ادھر بھی بدلیاں ہیں کچھ اُدھر بھی بدلیاں ہیں کچھ
یہ لکھائے ابر ہیں کہ بحر بیکراں ہیں کچھ
جو غنچے رازداں ہیں کچھ تو خار گلستاں ہیں کچھ
جو کوئی مطمئن سا ہے تو کوئی بیقرار ہے
جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے

گرج سے بادلوں کی بجلیاں چمک چمک پڑیں
تو جنبش صبا سے ٹہنیاں لچک لچک پڑیں
نگاہ کیف جو سے مستیاں ٹپک ٹپک پڑیں
جہاں کے ذرہ ذرہ پر نکھار ہی نکھار ہے
جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے

چمن کا پتہ پتہ آج گلستاں بدوش ہے
زمین کا ذرہ ذرہ وقف عیش و محو جوش ہے
ہر ایک رند میکدہ میں محو ناؤ نوش ہے
نہ کوئی سوگوار ہے نہ کوئی دل فگار ہے
جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے

یہ قطرے آرہے ہیں بادلوں سے چھوٹ چھوٹ کر
یہ تارے آسماں سے گر رہے ہیں ٹوٹ ٹوٹ کر
فضا میں رنگ بھر دیا ہے کس نے کوٹ کوٹ کر
یہ منظر حسین بھی محو کتنا خوشگوار ہے!!
جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے!!

قاضی نعمان جلالی محو

**ضرورت ہے** | اگر آپ کو خیمے دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے۔ والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں۔ فہرست اردو یا انگریزی کی منگا کر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا ہے۔ **محمد حسین اینڈ کونٹ مرچنٹ فتحگڑھ (یو۔پی)**

# ترانۂ دل

۱

نور ہوں، نار ہوں، کہ میں گل ہوں  
تیرے پہلو میں ہوں ترا دل ہوں  
قدر کر میری مشتِ خاک کہ میں  
بزم ہستی کا میر محفل ہوں

۲

تو سمجھتا ہے نقش باطل ہوں؟  
اک نمودِ کرشمۂ گل ہوں؟  
جس کو جبریل نے کیا سجدہ  
ارے کمبخت! میں وہی دل ہوں

۳

اس حقیقت کا میں بھی قائل ہوں  
ایک مدت سے ساکنِ گل ہوں  
آشنائے سکوں نہیں لیکن  
موجِ یم ہوں، حریفِ ساحل ہوں

۴

میں نہ لیلا ہوں اور نہ محمل ہوں  
جوہر باشعور ہوں۔ دل ہوں  
اے کفِ خاک! کام ہے مجھ سے  
میں حقیقت میں مصلحِ گل ہوں

امین حزین


## اب بھی وقت ہے

کہ آپ ظریف شاعروں کا تذکرہ نصف قیمت پر حاصل کرسکیں یہ تذکرہ تقریباً ۵۰۰ صفحات پر شائع ہوگا اسکی قیمت (للعہ) سے کم نہ ہوگی لیکن اگر آپ نے اشاعت سے قبل دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدئے تو آپ اتنی ہی رقم میں اسکے پانے کے مستحق ہوجائینگے۔ یہ تذکرہ اس قدر مکمل دلچسپ اور نئی چیز ہے کہ زبان اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی سیکڑوں ظریف شاعروں کے حالات انکے لطائف و ظرائف اور ان کے ظریفانہ کلام جو ہزاروں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی آپ کو نظر نہیں آسکتا۔ برسوں کی محنت و کاوش کے بعد ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے اور آپ اشاعت سے قبل اسے صرف دو روپیہ میں حاصل کرسکتے ہیں اشاعت کے بعد پھر کوئی رعایت نہ ہوگی۔ یہ کتاب سوائے ہمارے اور کہیں نہیں مل سکتی۔ تھوک فروش ایجنٹ اور کتب فروش بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو زیادہ سے زیادہ (۲۰) فیصدی کمیشن ملیگا بغیر روپیہ وصول ہوئے کوئی آرڈر درج رجسٹر نہیں کیا جائیگا۔

مینیجر نگار پریس نظیر آباد لکھنؤ

# بصایر

اُلّو سے سلیمان نے اک روز یہ پوچھا — کھیتوں میں تو کس واسطے دانہ نہیں کھاتا
اُس نے کہا ڈرتا ہوں اُلحضرت والا — جنت سے اسی دانے نے آدم کو نکالا
پوچھا کہ تو ویرانہ میں کیوں رہتا ہی دن رات — آبادیوں میں تجھکو بُری لگتی ہی کیا بات
بولا کہ یہ سب ایک ہیں دنیا کے مواطن — معمور ہے بھی ہوجائینگے ویرانے کسی دن
پوچھا کہ تو کیا کہتا ہے ویرانوں میں اکثر — جو کچھ ترا مفہوم ہے وہ مجھ سے بیاں کر
بولا مری تقریر میں یہ راز نہاں ہے — جو رہتا تھا کل مخلوق نہیں وہ آج کہاں ہی
پوچھا کہ تو آبادیوں میں کیوں نہیں آتا — بولا ستم انسان کا دیکھا نہیں جاتا
پوچھا ہمیں سمجھا دے ذرا اسکو وہ کیا ہی — جو کچھ کہ نشیمن میں ترے تیری صدا ہی
بولا کہ نشیمن میں ہی یہ میرا ترنم — چلنا ہی تمہیں غافلو ہشیار رہو تم
نزاد سفر ساتھ ہیں تم تا حد مقدور — بیفکر نہ ہو منزل مقصد ہی بہت دور

---

دیکھا فیثا غورث نے اک شخص کو — جس کی تھی پوشاک بیحد خوشنما
جب مگر کچھ گفتگو کرتا تھا وہ — تو غلط جملے بہت سے بولتا
دیکھکر یہ حال فیثا غورث نے — کان میں اس شخص کے جھک کر کہا
یا تو اپنی گفتگو کرلے درست — یا ابھی جا کر اُتار آ یہ قبا

---

لکھا حریف کو یہ آر دشیر بہمن نے — جو مانو ہمکو تو ہم تم کو بخشدیں یونان
اگر ہمیشہ ہمارے مطیع ہوکے رہو — تو فائدہ ہو تمہیں اور ہم کو اطمینان
لکھا حریف نے اسکو جواب میں کہ جناب — حقیقی فائدہ سوچے اگر کہیں انسان
نہ دیکھے ملک کو غیروں کے آنکھ بھر کے کبھی — کسی طرح سے نہ ہو نچائے غیر کو نقصان
عدو کو فائدہ ہو نچانے کے لئے بے خوف — خوشی کے ساتھ کرے اپنا فائدہ قربان
بجائے اسکے کہ مل جاؤں اپنے دشمن سے — میں جان دینا سمجھتا ہوں جنگ میں آسان
بجائے اسکے کہ حاکم ہوں قوم پر اپنی — زیادہ خوش ہوں میں آزاد ہو اگر یونان

عبدالباری آسی

## فراق گورکھپوری

عشق کی مایوسیوں میں سوزِ پنہاں کچھ نہیں
اس ہوا میں یہ چراغِ زیرِ داماں کچھ نہیں

کیا ہے دیکھو حسرتِ سیرِ گلستاں کچھ نہیں
کچھ نہیں اے ساکنانِ کنجِ زنداں کچھ نہیں

جینے والے جی رہے ہیں اور ہی عالم میں اب
دوستو طولِ غمِ شبہائے ہجراں کچھ نہیں

عشق کی ہے خود نمائی عشق کی آشفتگی
روئے تاباں کچھ نہیں زلفِ پریشاں کچھ نہیں

درد کے مارے ہوئے کل روتے روتے ہنس پڑے
پھر کہو گے عشق کی تاثیرِ پنہاں کچھ نہیں

آنکھ والے دیکھ لیں میرے سیہ خانے کی سیر
ماہِ تاباں کچھ نہیں مہرِ درخشاں کچھ نہیں

ایک ہو جائے نہ جبتک سرحدِ ہوش جنوں
ایک ہو کر چاکِ دامان و گریباں کچھ نہیں

یاد آ ہی جاتی ہے اکثر دلِ برباد کی
یوں تو سچ ہے چند ذراتِ پریشاں کچھ نہیں

کاش اپنے ہجر سے بیتاب ہوتے اے فراق
دوسرے کے واسطے حالِ پریشاں کچھ نہیں

## فرخ بنارسی

پھر وہ نظر ہے سلسلہ جنبانِ اضطراب
پھر آرزو ہے دست و گریبانِ اضطراب

قایم تپش پہ دل کی نظامِ حیات ہے
یعنی ہے اضطراب ہی عنوانِ اضطراب

تڑپا گئے وہ اور محبت سے دیکھ کر
ہر جنبشِ نظر میں تھا سامانِ اضطراب

وہ شوخیِ تبسمِ پنہاں وہ چشمِ ناز
اک جانِ اضطراب اک ایمانِ اضطراب

موجیں اٹھیں امید کی پھر حیات میں
پھر دل میں جوش زن ہوا طوفانِ اضطراب

تاثیرِ جذب سے کوئی خود کھنچ کے آگیا
بھولوں گا حشر تک نہ یہ احسانِ اضطراب

بجلی تمام جسم میں بھرتی ہے کوندتی ہو
چھیڑے نہ یوں بھی کوئی رگِ جانِ اضطراب

تیرا جمال رونقِ گلستانِ آرزو
تیرا خیال شمعِ شبستانِ اضطراب

فرخ کہیں نہ حسن کی ہوں بے حجابیاں
کیوں چاک کر رہے ہو گریبانِ اضطراب

# معلومات و اقتباسات

**بڑے بڑے معلق پل**

اہل امریکہ کا شغف تعمیر کی طرف جس قدر شدت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اس کا ثبوت وہاں کی نہ صرف فلک پیما عمارتوں سے بلکہ اور تعمیروں سے بھی ملتا ہے جو فن انجنیری کے دلایل کمال میں شمار کی جاتی ہیں۔

اس وقت وہاں تین معلق پل خاص شہرت رکھتے ہیں، ایک کا نام بروکلن کا پل ہے یہ دنیا کا سب سے پہلا معلق پل ہے۔ (معلق پل کے معنے یہ ہیں کہ دریا کے اندر کوئی ستون قایم نہیں کیا جاتا بلکہ دونوں طرف ساحل پر ایک ایک ستون قایم کرکے پل بنایا جاتا ہی) اس کی تعمیر ۱۸۶۹ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۸۳ء میں ختم ہوئی۔ اس پر ۳۰ لاکھ گنی صرف ہوئیں۔ اس کے بعد اسکی اصلاح درست میں بھی ۱۲ لاکھ گنی صرف کی گئیں۔ یہ پل عجایب عالم میں شمار کیا جاتا ہی کیونکہ اس کے دونوں بُرجوں یا ستونوں کے درمیان ۱۵۹۵ فٹ کا فصل ہے اور پل کی لمبائی ۶۰۱۶ فٹ ہے۔ ستون کی لمبائی ۲۰۸ فٹ ہے اور چوڑائی ۸۵ فٹ۔

لیکن اب اہل امریکہ اس پل سے بھی زیادہ حیرت انگیز معلق پل طیار کر رہے ہیں جن میں سے ایک کا نام ولیمز کا پل ہے۔ اس کی لمبائی ۷۲۰۰ فٹ اور چوڑائی ۱۱۸ فٹ ہی اس کے ستون ۳۳۵ فٹ بلند ہیں اور دونوں ستونوں کے درمیاں ۱۶۰۰ فٹ کا فصل ہی۔ اسپر چار پٹریاں ٹراموے کی، دو راستے موٹروں کے لئے اور دو پیدل چلنے والوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اس پل کی تعمیر میں ۴۸ لاکھ گنی صرف ہوئی ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور معلق پل دریائے ہڈسن پر بنایا جا رہا ہے اور جس کی تعمیر ۱۹۳۲ء میں ختم ہوگی۔ اس میں آٹھ سڑکیں موٹروں اور ٹراموے کے لئے ہونگی اور دو پیدل چلنے والوں کے لئے۔ اس کے دونوں ستونوں کے درمیاں ۳۵۰۰ فٹ کا فصل ہوگا اور ستون کی بلندی ۶۵۰ فٹ ہوگی۔ اس پل کے دونوں جانب جو فولادی رسیاں پل کو سنبھالنے کے لئے ہونگی وہ چار ہونگی جنمیں سے ہر ایک کا محیط یا گولائی ۳۶ انچہ ہوگی اور ہر رسی کا وزن سات ہزار ٹن ہوگا۔ ان رسیوں کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہر رسی ۲۶۴۷۴ باریک لڑوں سے بنائی گئی ہی جن میں سے ہر لڑ کی گولائی $\frac{3}{16}$ انچہ ہی۔

یہ رسیاں دونوں جانب دو بُرجوں سے باندھی جائیں گی جن میں سے ہر ایک کا رقبہ ایک ایک ایکڑ ہوگا۔ اس پل میں ۶۰ لاکھ گنی کے صرف کا اندازہ کیا گیا ہے۔

**ریاضیات اور مشرق قدیم**

تحقیق انسانی جس قدر وسیع ہوتی جائے گی، اسی قدر مشرق کی علمی خدمتیں نمایاں ہوتی جائیں گی چنانچہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہی کہ تمام موجودہ تجارتی حسابات، اوزان اور پیمانوں کا تعین، ہندسی طریقہ سے زمین کی پیمائش، اور نظام ستینی (جس میں اعداد کا حساب و شمار ۶۰ سے کیا گیا ہے) اور جس کا تتبع اب بھی جاری ہی کہ گھنٹہ کی تقسیم ۶۰ منٹ میں اور منٹ کے ۶۰ سکنڈ میں، اور دائرۂ فلکی کی تقسیم ۳۶۰ درجوں میں اور ہر درجہ

کی ۶۰ دقیقہ میں اور ہر دقیقہ کے ۶۰ ثانیہ میں کی جاتی ہے) یہ سب بہت قدیم چیزیں ہیں۔ یہاں تک کہ مابین النہرین جو ٹائل (اینٹیں) حال ہی میں زمین سے برآمد ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ہندسی اصول ۳۰۰۰ قبل مسیح مرتب ہو چکے تھے۔

انھیں اینٹوں کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے لیکر ۶۰ تک اعداد کا مربع، انکا مکعب اور جذر اس وقت معلوم ہو چکا تھا۔ علاوہ اس کے نسبت و تناسب، اور ہندسوں کا سلسلۂ متصلہ بھی ان کی علم میں تھا اور اشکال ہندسی مربع مستطیل، مثلث و دائرہ بھی وہ جانتے تھے۔

فلکیات میں وقت اعتدال ربیعی کی تعین انھوں نے کر لی تھی جس سے وہ اپنے سال کی ابتدا کرتے تھے اور اول مہینہ کا نام انھوں نے وہ رکھا تھا جسے اب ثور کہتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آفتاب برج ثور میں جاتا تھا اس وقت سے وہ سال کی ابتدا کرتے تھے۔ انھوں نے دائرہ بروج کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے سیاروں کی حرکت کو بھی متعین کیا تھا۔ سال کبیسہ، دھوپ گھڑی، فصلوں کی تقسیم، نجوم و کواکب کے اوقات طلوع و غروب کی تعیین یہ سب اسی وقت ہو چکا تھا اور ایسا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ فن جہاز رانی میں ان باتوں کے علم کی سخت ضرورت تھی یہ باتیں ۵۰۰۰ سال قبل مسیح کی ہیں۔

اب اس کے بعد ۴۲۴۱ قبل مسیح مصر میں جو کچھ ہوا اسے بھی دیکھئے کہ انھوں نے سال کو بارہ مہینوں میں اور ہر مہینہ کو ۳۰ دن میں تقسیم کیا اور باقی پانچ دنوں کا اضافہ کر کے ان کو تہوار کی صورت دی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضبط حساب، نظام عدد اور علم رصد میں وہ کتنی دستگاہ رکھتے تھے اسی کے ساتھ فن تعمیر، مکانکی معلومات، علم مساحت عملی میں بھی اُن کی ترقی اس سے ثابت ہے کہ مسافات بعیدہ تک خطوط مستقیم کا قایم کرنا اور سطح مستوی کی تعیئن یہ سب اُن کو معلوم تھا۔ چنانچہ اہرام مصری کی تعمیر کو دیکھئے کہ اس کے زوایا اور جوانب کے تعین میں موجودہ آلات کی مدد سے بھی جو غلطی نکالی جا سکتی ہے اس کے مقدار نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس زمانہ کے بعد معلومات یونان میں منتقل ہوئیں جہاں اصول علمی پر ان کی تدوین ہوئی اور افلاطون، ارسطو، ارخمیدس اور اقلیدس ایسے انسان پیدا ہوئے۔ جب عہد اسلام آیا تو مسلمانوں نے علوم طبیعی، ریاضیات، فلکیات کی تمام کتابیں، یونان اور ہند سے لیکر اپنی زبان میں منتقل کیں، جب خلفاء عباسیہ کا زمانہ ہوا تو ترجمہ و تالیف کے مستقل شعبے قایم کئے گئے اور تمام علوم یونان و ہند کو اپنا کر لیا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ مسلمانوں نے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا اور اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ کیونکہ اب تحقیقات جدیدہ سے اس خیال کی غلطی ثابت ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نظریات اعداد، تہذیب ارقام تبویب موضوعات میں اُن کے اضافے اب بھی رائج ہیں۔ صفر کی ایجاد مسلمانوں کی ہے جس کو بجنسہ انگریزی میں ( Cipher ) کے نام سے لیا اور کسر عشری کی علامت فاصلہ بھی انھوں نے ہی مقرر کی علم جبر میں اس کے اصول کا وضع کرنا، علامات و اشارات کے تعین سب مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔

خوارزمی ہی اول وہ شخص تھا جسنے اس علم کا نام علم الجبر والمقابلہ رکھا اور پھر یورپ نے اُس کو ( Algebra ) کے نام سے اپنے ہاں لے لیا۔ ریاضی کا یہ نظریہ کہ دو مکعب عددوں کا مجموعہ، عدد مکعب نہیں ہو سکتا، اہل عرب ہی کا نکالا ہوا ہے

علم مثلثات و تناسب میں ان کی خدمات نہایت بلند ہیں۔ قانون تناسب جیوب، ضوابط مثلثات کروی غیر قائمۃ الزاویہ، قاطع و نظیر کا علم، وضع جداول، سطح کروی بر اصول نقشہ کشی یہ سب مسلمانوں ہی کے ایجاد میں ہیں۔

فلکیات میں اُن کے خدمات اور زیادہ اہم ہیں خط نصف النہار سے طول درجہ کا معلوم کرنا، قیام حرکات قمر کی جدولوں کی تصحیح، زمین کی گردش کے لحاظ سے رصد گاہوں کا قائم کرنا وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی بناء پر مسلمانوں کو یونانیوں سے تفوق حاصل ہو، کیونکہ یونانیوں کے ہاں جو کچھ تھا وہ صرف نظری تھا، مسلمانوں نے اپنے عمل و استقراء سے اُس کو مستقل علم کی صورت ویدی۔

## کہکشان سے اُس طرف

قدماء نے یہ امر دریافت کر لیا تھا کہ قبۂ فلکی میں بعض اجرام روشن بادوں کی طرح ایسے بھی ہیں جو نہ شمس وقمر ہیں اور نہ اُن کو نجوم کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ابوالحسن صوفی نے جو اہل عرب میں فلکیات کا بہت بڑا ماہر تھا لکھا ہو کہ مین نے خود ان روشن بادلوں کو دیکھا جس کا نام اُس نے "لطخہ سحابیہ" رکھا اور انگریزی میں جسکو ( Nebula ) یا عربی کی جدید اصطلاح میں سدیم کہتے ہیں۔ جسوقت تک دوربین ایجاد نہیں ہوئی یہ اجرام دخانی یا سدیم فلکیات کا نہایت پیچیدہ معمہ بنے رہے۔ جب گلیلو نے دوربین بناکر اس کی مدد سے کہکشاں کو دیکھا جس میں اجرام سدیمی پائے جاتے ہیں تو اُس نے کہا کہ جس کا نام کہکشاں ہو وہ حقیقتاً "بیشمار ستاروں کا مجموعہ ہو جو بہت قریب قریب واقع ہونے کیوجہ سے علٰحدہ علٰحدہ نظر نہیں آتے۔ جب سترہویں صدی کے آخر میں نیوٹن نے دوربین عاکس ایجاد کی اور اس اصول پر بڑی بڑی دوربینیں بن گئیں تو اجرام سدیمی کا مطالعہ ایک مخصوص علم ہوگیا اور بہت سی وہ باتیں معلوم ہونے لگیں جو اس سے قبل غیر معلوم تھیں اور خدا معلوم کتنے سدیمی اجرام جو مختلف شکلوں کے ہیں اور مختلف حالتوں سے گزر رہے ہیں نظر آنے لگے۔

اجرام سدیمی دو قسم کے ہیں ایک وہ جو بالکل بادل کی طرح مشتعل اور ملتہب گیس (یا دھوئیں) کی صورت میں پائے جاتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو کمانی کی طرح چکردار صورت رکھتے ہیں۔ اول اول یہ خیال کیا گیا تھا کہ یہ چکردار سدیم بہت سے چھوٹے ستاروں کا ہجوم ہو جو ہمارے آفتاب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو۔ لیکن جب آلات رصد و تصویر و حل طیفی (یعنی مثلثی شیشہ کے ذریعہ سے انحلال نور) مکمل ہوگئے اور ان کے ذریعہ سے تحقیق کی گئی تو ثابت ہوا کہ ہر سدیم ہماری کہکشاں کی طرح ایک مستقل کائنات ہو اور اس طرح کے سدیم فضا میں ہزاروں لاکھوں پائے جاتے ہیں۔ پس سدیم اس جہت سے دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ہماری کہکشاں میں شامل ہیں اور دوسرے وہ جو اس سے خارج ہیں

ہماری کہکشاں ایک بڑا مجموعہ ہو ستاروں کا اور گیسی سدیم کا جس میں بعض ستارے تو ایسے ہیں جو آنکھ سے نظر آجاتے ہیں، ہزاروں وہ ہیں جو دوربین کی مدد سے دیکھے جاسکتے ہیں اور لاکھوں وہ ہیں جو تصویری کی لوح پر نظر آسکتے ہیں۔

رصد سے ثابت ہوا ہے کہ کہکشان ایک قرص ہے جس کے قطر کا طول ایک لاکھ نوری سال کا ہو اور ہمارا نظام شمسی تقریباً اس کے وسط میں واقع ہو۔

کہکشاں کے قرص میں ۳۰ ہزار ستارے ایسے ہیں جو بہت دور دور منتشر ہیں اور چونکہ ایک کا بُعد دوسرے سے یکساں نہیں ہے اس لئے مختلف جگہ جھمگھٹ سا نظر آتا ہے اور بعض جگہ روشن بادل کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے کہکشاں میں گیسی سدیم بھی ہیں جن میں سے بعض روشن ہیں اور بعض تاریک۔

وہ اجرام سدیمی جو ماورائے کہکشاں ہیں ان کا مطالعہ پروفیسر ہبل امریکی نے جو مشہور فلکی ہے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے ۴۰۰ سدیمی اجرام کا حال معلوم کر چکا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ان اجرام میں سے بعض کی خاص ہیئت وصورت نہیں ہے۔ لیکن اکثر چکر دار ہیں یا بیضوی ہیں۔ یہ اجرام ۹ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہیں اور ان کی رفتار ۳۰۰ کلیومیٹر فی سکنڈ ہے بعض ۶۰۰ کلیومیٹر فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں۔

ان سدیمی اجرام میں سے ایک چکر دار جرم ہمارے آفتاب سے دو ارب گنا بڑا ہے اور اس کا ایک چکر ایک کرور ستر لاکھ سال میں پورا ہوتا ہے۔

## قوت و ضعف کی جنگ

بعض لوگ اصول ارتقا پر ہنسی اڑاتے ہیں، اور انتخاب طبیعی، تنازع للبقا، اور بقاء اصلح کو لغو و مہمل قرار دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ نظام عالم اور اصول فطرت پر غور کریں تو انھیں ان مسائل کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

تاریخ انسان اپنے ابتدا ظہور سے لیکر اس وقت تک شاہد ہے کہ جس طرح عہد وحشت میں قوی ضعیف کو ہلاک کر ڈالتا تھا اسی طرح اب زمانۂ تہذیب میں بھی کمزور کا کہیں ٹھکانا نہیں ہے عالم حیوانات میں مشاہدہ کرنے سے بہت سی مثالیں اس کی نہایت وعجیب مل سکتی ہیں۔ چنانچہ آج کی صحبت میں ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

ایک مچھلی ہے جس کا نام ہی مختلف زبانوں میں تیر انداز ہو گیا ہے۔ جب یہ کسی کیڑے کو ساحل کی گھاس پر دیکھ لیتی ہے تو نہایت آہستہ آہستہ جسقدر قریب ممکن ہوتا ہے پہونچ جاتی ہے، پھر اپنے منہ میں پانی بھر کے نہایت قوت کے ساتھ اسپر پانی پھینکتی ہے جس کے صدمے سے وہ کیڑا بیہوش ہو کر پانی میں گر جاتا ہے اور وہ اسے نگل لیتی ہے۔ یہ مچھلی جزائر ہند کے دریاؤں میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔

گھڑیال شکار کرنے کے لئے گھاس پر یا پانی میں دنوں تک بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے گویا وہ مر گیا ہے۔ اور جب شکار اس کے قریب سے اس کو بے جان سمجھکر گزرتا ہے، تو بجلی کی طرح جھپٹ کر اُس کو پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح ایک سانپ ہے جو درخت میں لٹکا رہتا ہے اور اس قدر سکون کے ساتھ کہ شاخ میں اور اس میں کوئی تمیز نہیں ہو سکتی جب شکار درخت کے نیچے سے گزرتا ہے تو اس کو لپیٹ لیتا ہے۔ افریقہ کے جنگلوں میں ایک قسم کی جونک ہوتی ہے جو درخت کی شاخوں میں لٹکتی رہتی ہے اور جب کوئی انسان یا جانور نیچے سے گزرتا ہے تو اس کے جسم پر گر کر لپٹ جاتی ہے اور خون چوسنے لگتی ہے۔

ایک مچھلی عجیب و غریب حیلہ سے شکار کرتی ہے اس کے ناک کے پاس کا حصہ "مرغ کیس" گھاس کی طرح ہوتا ہے،

جب اس کو شکار کرنا ہوتا ہے تو کیچڑ میں اپنے آپ کو دفن کر دیتی ہے اور صرف وہی ناک کا حصہ اوپر رکھتی ہے، گھاس پات کھانے والے کیڑے اس کو دیکھ کر دوڑتے ہیں کیونکہ وہ اُسے مرغ کیس سمجھتے ہیں، جب کیڑے قریب آجاتے ہیں تو یہ منہ کھول کر فوراً نگل جاتی ہے۔ بعض کیڑے زمین میں اس طرح سوراخ کرتے ہیں کہ چاروں طرف ریت یا مٹی احاطہ کئے رہے اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی اور کیڑا اسپر سے گزرے تو پھسل کر نیچے سوراخ میں آجائے۔

ایک جانور ہے جس کی غذا چیونٹی ہے۔ اس کی زبان بہت لمبی ہوتی ہے۔ جب اس کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو اپنی زبان نکال کر پڑجاتا ہے۔ اور چیونٹیاں اس کا لعاب چاٹنے کے لئے جمع ہوجاتی ہیں۔ جب چیونٹیوں کی کافی تعداد زبان سے لپٹ جاتی ہے تو یہ زبان کو منھ کے اندر کرلیتا ہے اور ایک لمحہ میں ان سب کا قصہ ختم کردیتا ہے۔

## سیال ستارے

انگلستان کی جمعیۃ فلکیہ کے پریسیڈنٹ پروفیسر جینز کی رائے ہے کہ اکثر ستارے فضا میں سیال ہیں، یعنی پانی کی طرح ان میں سیلان پایا جاتا ہے۔ دیگر علمار کی رائے اسوقت تک یہی ہے کہ ستارے گیسی یا دخانی حالت میں پائے جاتے ہیں، لیکن اس پروفیسر نے یہ جدید تحقیق پیش کی ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ فضا میں جو اکثر دو دو ستارے ساتھ نظر آتے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ ایک دوسرے کے گرد طواف کر رہا ہے یا دونوں کسی اور مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں، علمار کی رائے ہے کہ ہر جوڑ واں ستارے کی اصل ایک ہی ستارہ ہے جو دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے اور اس طرح وہ دونوں حصے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں۔ پروفیسر مذکور کا بیان ہے کہ اگر ستارے گیسی یا دُخانی حالت میں ہوتے تو اسطرح دو حصے اُن کے نہ ہوسکتے، لیکن سیال ہونے کی حالت میں ایسا ہوجانا بہت آسان ہے۔

## معجزۂ انجنیری

سب سے زیادہ عجیب وغریب تعمیر جو ۱۹۲۶ء میں ختم ہوئی ہے۔ امریکہ کے صوبہ کولوراڈو کی ایک سرنگ ہے جو چھ میل لمبی ہے۔ اسی طرح ایک اور سرنگ ہے جو نیویارک اور نیوجرزی کے درمیان موٹروں کے لئے بنائی گئی ہے اس کا طول دو میل ہے۔

ایک اور حیرت انگیز عمارت کلیفورنیا میں بنی ہے جو دو محرابوں پر قایم ہے جن میں سے ہر ایک کی وسعت ۱۱۰۰ فٹ ہے۔ اسیطرح امریکہ میں ایک بجلی گھر بنایا گیا ہے۔ جہاں پانی کے ذریعہ سے کہربائی قوت پیدا کی جاتی ہے اور یہ قوت ۱۹۰۰۰۰ گھوڑوں تک پہونچتی ہے

## انسان کا عہد اولین

خیال کیا جاتا تھا کہ سب سے پہلے انسان کا ظہور وسط ایشیا میں صحرا گوبی کے اندر کسی جگہ ہوا تھا کیونکہ یہاں پانی اور گھاس کی اس وقت کثرت تھی، لیکن اب اہل فرانس و انگلستان کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے انسان ان کی سرزمین میں پیدا ہوا کیونکہ وہاں بعض مقامات سے جو چقماق کا پتھر دستیاب ہوا ہے وہ اسی قسم کا ہے جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ انسان کے عہد حجری میں اس کا بڑا رفیق تھا۔ لیکن اگر اسکو صحیح مان لیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان عہد حجری میں وہاں پایا جاتا تھا۔ لیکن وہ زمانہ جو عہد حجری سے پہلے کا ہے اس کے متعلق انگلستان یا فرانس کیا ثبوت پیش کرسکتا ہے۔